اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

دسمبر ۲۰۲۱ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ کے زیرِ انتظام

تدریس القرآن پراجیکٹ

فری کتابیں اور فری ٹیچرز ٹریننگ

* سکولوں میں آسان انداز میں ترجمۂ قرآن سکھانے کا پروگرام
* پانچویں جماعت سے اوپر کی جماعتوں کے لیے
* اساتذہ کی گائیڈ اور طلبہ کی کتاب بلا ترجمہ الگ
* دو رنگوں میں نفیس طباعت
* لاہور کے سکولوں میں تنفیذ کی خصوصی مہم جاری ہے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ

15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

0300-4107282   300-4354673

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

عصری تعلیم کی اصلاح

	قیمت
ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل	٦٠٠
اسلامی سکول کے خدوخال	١٥٠
تعلیم اور اس کا اسلامی کردار	٣٠٠
یکساں قومی نصاب - خدشات ومضمرات	٢٥٠
تدریس القرآن ① برائے معلمین (ڈاک خرچ)	٥٠
تدریس القرآن ① برائے طلبہ وطالبات (ڈاک خرچ)	٥٠
پنج سورہ (اُردو تفہیم) (ڈاک خرچ)	٥٠
اسلامی علوم میں تحقیق: اصول، ترجیحات اور معیار	٣٥٠
ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت (زیرِ طبع)	

طلبہ کی اسلامی تربیت

تعلیمی ادارے اور کردار سازی	٢٥٠
تعلیمی اداروں میں تعمیرِ سیرت - ہینڈ بک وگائیڈ	٣٠٠

اصلاحِ دینی مدارس

ہمارا دینی نظامِ تعلیم	٤٥٠
نصابِ مدنی	٨٠
مدرسہ ڈسکورسز - مطالعہ وتجزیہ	٢٥٠
اصلاحِ دینی مدارس	٤٠٠

اسلامی تحریکیں

پاکستان کی دینی قوتیں غیر موثر اور ناکام کیوں؟	٣٠٠

	قیمت
ایک نئی ہمہ جہت اصلاحی تحریک کی ضرورت (ڈاک خرچ)	٤٠
خاموش انقلاب - ناگزیر ہے	٣٥٠
عصرِ حاضر میں دین کا متوازن تصور	١٥٠

تزکیۂ نفس

اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)	١٥٠٠
حقیقت تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)	٨٠
اپنی اصلاح آپ کیسے؟	٨٠
ترکِ رذائل (احمد جاوید)	٣٥٠
اسلام اور تعمیرِ سیرت (زیرِ طبع)	

مغربی فکر وتہذیب

اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش	٣٥٠
اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ	٢٥٠
اسلام اور ردِّ مغرب	٣٠٠

فہم دین

مسلم نشاۃ ثانیہ - اساس اور لائحہ عمل	٤٧٥
مقالاتِ امین (جلد اوّل)	١٠٠٠
مقالاتِ امین (جلد دوم)	١٠٠٠
شاتمِ رسول کے قتل کی شرعی حیثیت	٥٠

مکتبہ البرہان

15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔ فون 0309-4607124 ای میل ermpak@hotmail.com

ماہنامہ
البرہان
لاہور
جلد ۲۵، شمارہ ۱۲، دسمبر ۲۰۲۱ء/ ربیع الثانی ۱۴۴۳ھ

مشمولات

O بیاد پروفیسر ملک محمد حسین مرحوم
- میرے ابا جان — ڈاکٹر طاہرہ کلثوم — ۴
- اپنی کہانی کیسے کہیں؟ — عبدالحسیب مجاہد — ۱۱
- میرا دوست محمد حسین — سید امام شاہ — ۲۳
- پروفیسر ملک محمد حسینؒ: چند یادیں — صفدر ملک امیر — ۲۷
- ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے — ڈاکٹر محمد امین — ۲۹
- پروفیسر ملک محمد حسینؒ: ایک معلّم، ایک قلم کار — ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی — ۳۳
- تعلیم کی اصلاح اور اسلامی تشکیل میں — ڈاکٹر ابصار احمد — ۴۱
پروفیسر ملک محمد حسینؒ کی اَن تھک اور ناقابل فراموش مساعی
- علم کا ایک اور آفتاب غروب ہوا — محمد یحییٰ رشید — ۴۶
- آہ پروفیسر ملک محمد حسین مرحوم! — ڈاکٹر انوار احمد بگوی — ۵۰
- اسلامی تحریکیں اور عالمی و مقامی مقتدرہ کا جبر — پروفیسر ملک محمد حسینؒ — ۵۴
البرہان کے لیے ملک صاحب مرحوم کا آخری مضمون
- تعزیتی ریفرنس — مدیر — ۵۹
O تعلیم و تربیت
- اصلاحِ تعلیم کے لیے ناگزیر اقدامات — پروفیسر ڈاکٹر اظہار الحق — ۶۱
- انسانی زندگی میں استاد کی اہمیت — ڈاکٹر اللہ بخش ملک — ۶۲
O اسلام اور پاکستان
- پاکستان میں نفاذ دین: کیوں اور کیسے؟ — ڈاکٹر محمد امین — ۶۴
- عمران خان کیوں ناکام ہوئے؟ — ۶۸
O تفہیم مغرب
مغربی سائنس کی ہلاکت خیزیاں — سید خالد جامعی — ۶۹
O افغانستان
- لبرلز اور متجددین کی طرف سے اسلامی افغانستان کی مخالفت — مدیر — ۷۲
خورشید ندیم کے مضمون پر تبصرہ
- مسلم ممالک افغانستان کی حمایت کیوں نہیں کرتے؟ — اوریا مقبول جان — ۷۹
O تبصرۂ جرائد
ماہنامہ 'الحق' اور سہ ماہی 'البیان' — مدیر — ۸۲

مدیر
ڈاکٹر محمد امین

ادارۂ تحریر
ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
حافظ عمران رضا طحاوی

لیگل ایڈوائزر
محمد یحییٰ رشید، ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

انچارج سرکولیشن
(0309-4607124)
[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت
اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِ اعانت: فی شمارہ 70 روپے
سالانہ 800 روپے۔ پانچ سال: 4000 روپے
تاحیات 15,000 روپے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ
سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور
PK92SONE0000120000056341

برائے رابطہ
15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور
ermpak@hotmail.com

برائے آن لائن مطالعہ
www.alburhanmonthly.org

کمپوزنگ: حافظ محسن یوسف
0306-4640366

یادرفتگان		ڈاکٹر طاہرہ کلثوم[1]

میرے ابّا جان

ان کا اٹھنا نہیں ہے حشر سے کم
گھر کی دیوار باپ کا سایہ

بہت دنوں سے میں اپنے ابا جان کے لیے لکھنا چاہتی ہوں۔ کاغذ قلم لے کر بیٹھتی ہوں، ہمت مجتمع کرتی ہوں اور ذہن و دل جب ماضی کے اوراق پلٹنے لگتے ہیں تو آنکھیں آنسوؤں سے اور دل اداسی سے بھر جاتا ہے۔ رم جھم اتنے تواتر سے ہوتی ہے کہ صفحہ قرطاس دھندلا کر رہ جاتا ہے۔ بھائی ہر روز پوچھتا ہے ابو کے لیے کچھ لکھا؟ کب لکھو گی؟ تمہیں لکھنا چاہیے۔ اور میرے پاس ان تمام سوالوں کے جواب نہیں ہوتے۔ میں اسے یہ نہیں بتا پاتی کہ میں لکھنے بیٹھتی ہوں تو میرا حوصلہ ٹوٹنے لگتا ہے۔ ابا جان کے جانے کے بعد مَیں خود کو ابھی ایک خلا میں معلق پاتی ہوں۔ یقین اور بے یقینی کی عجیب کیفیت ہے کہ اس کو کوئی نام دینا بھی مشکل ہے۔ ابھی میں اپنے آپ کو اس بچے کی طرح پاتی ہوں جس کی بند مٹھی سے ریت پھسل جائے تو وہ پریشان ہوتا ہے کہ بند مٹھی سے ریت کیسے پھسل گئی۔ میں جو رات بھر ہسپتال کے کمرے میں اپنے ابا جان کا بازو تھامے اور سر سہلاتے ہوئے ان کے سرہانے اس آس پر کھڑی رہتی تھی کہ اگلی رات ہونے سے پہلے وہ ہسپتال سے ڈسچارج ہو جائیں گے اور یہ امید بیجا نہیں تھی۔ پاکستان بھر سے ان کے دوست احباب کہہ رہے تھے کہ ہم اپنے علاقوں میں ان کے لیے اجتماعی دعاؤں کا اہتمام کر رہے ہیں۔ ان کے کتنے ہی احباب نے کہا کہ وہ باقاعدہ نوافل ادا کرتے ہیں اور ان کی صحت یابی کے لیے دعا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر مہر سعید اختر صاحب، جو میرے ابا جان کے دوست اور میرے استاد محترم ہیں، ان کے الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہتے ہیں کہ ملک صاحب نے ٹھیک ہونا ہے اس لیے کہ اب بھی بہت سے ضروری کام باقی ہیں اور ان کا یہ کہنا کہ یہ وہ فرد واحد ہیں کہ جنہوں نے سب سے پہلے سنگل نیشنل کریکولم کے خلاف آواز اٹھائی اور پھر پورے ملک کی آواز بنا دی۔ اور میرے استاد محترم

---

[1] ملک صاحب مرحوم کی صاحبزادی

ڈاکٹر مشتاق الرحمٰن صدیقی کا یہ کہنا کہ ہمارے قبیلے کو ابھی اس دبنگ آدمی کی ضرورت ہے۔ یہ سب باتیں جہاں میرے دل میں ایک قابل فخر باپ کی بیٹی ہونے کا احساس جگاتی تھیں وہیں پر اطمینان بھی پیدا کرتی تھیں کہ ابا جان بہت ساری دعاؤں میں ہیں اور اللہ عزوجل ان شاءاللہ اپنا کرم فرمائیں گے۔ اب سوچتی ہوں وہ تمام دعائیں ان کے لیے آخرت میں زادِراہ بنیں گی، ان شاءاللہ۔

میں اپنے ابا جان کی پوری زندگی پر نظر ڈالتی ہوں اور ان کے کردار کو مختلف رشتوں کے حوالے سے دیکھتی ہوں تو مجھے وہ ایک مثالی باپ، مثالی بیٹے، مثالی شوہر نظر آتے ہیں۔ ان کا کردار صرف ان کی اولاد کے لیے ہی مثالی نہیں تھا بلکہ وہ اپنے پورے خاندان میں ایک رہنما، ایک مربی، ایک مددگار اور ایک بہترین صلاح کار کے طور پر جانے جاتے تھے۔

ابا جان اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ایک انتہائی مودب، فرمانبردار اور خدمت گزار بیٹے۔ مجھے نہیں یاد پڑتا کہ جب تک دادی جان زندہ رہیں، ابا جان نے کبھی ان سے اونچی آواز میں بات کی ہو یا ان کی کسی بات کو ٹالا ہو۔ ۱۹۷۴ء میں جب ابا جان امریکن یونیورسٹی بیروت سے ایم فل کر کے فارغ ہوئے تو انہیں نائجیریا میں ملازمت کی پیشکش ہوئی۔ دادی جان سے ملازمت کا ذکر کیا اور اجازت چاہی تو انہوں نے کہا: میں اپنے اکلوتے بیٹے کو بھی اگر پیسہ کمانے کے لیے باہر بھیج دوں گی تو خود کیا کروں گی؟ اور ابا جان نے اس پیشکش کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ میری والدہ مجھے اجازت نہیں دیتیں۔ ایک بھائی کے طور پر انہوں نے اپنی چھوٹی بہن کو ہمیشہ بہت احترام، مان اور محبت دی۔ ان کی زندگی کی ہر خوشی اور غم میں آگے بڑھ کر شریک ہوئے۔ زندگی کے ہر مشکل مرحلے میں ان کا ساتھ دیا۔ بہن بھائی میں ایسی مثالی محبت بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ مَیں سمجھتی ہوں کہ انہوں نے اپنے بچوں کے لیے بھی ایک مثال اور معیار قائم کر دیا ہے۔ اللہ ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے، آمین۔

ایک شوہر کے طور پر بھی ان کا کردار قابل قدر اور قابل تقلید ہے وہ خود اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہماری امی جان گھریلو سطح کی تعلیم کے ساتھ ایک سادہ سی دیہاتی خاتون۔ مگر دونوں نے ایک خوبصورت اور مثالی زندگی گزاری۔ امی جان کی زندگی میں ہمیں ان دونوں کے درمیان اتنی شدت سے ان کے تعلق کی گہرائی کا اندازہ نہیں ہوا مگر چار سال پہلے جب امی جان کا انتقال ہوا تو ابا جان جس طرح ایک بہت شدید صدمے میں اور گہری اداسی میں گھر گئے تو ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ خود کو

امی جان کے بغیر کتنا تنہا محسوس کر رہے ہیں۔ ابا جان گاہے بگاہے امی جان کی سلیقہ مندی، کفایت شعاری اور ان کے گھریلو انتظام و انصرام کی مثالیں دیتے تو جہاں دل مطمئن ہوتا تھا کہ ہماری امی جان اپنے شریک حیات کو خوش اور راضی چھوڑ کر رخصت ہوئی ہیں وہیں یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ ابا جان ان کو یاد کرتے ہیں اور ان کی کمی محسوس کرتے ہیں۔

ابا جان بحیثیت والد بہت نرم خو اور لچکدار رویے کے حامل تھے اگرچہ بنیادی اخلاقی معیارات پر انہوں نے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ اگر میں اپنے بچپن کو یاد کروں تو مجھے نہیں یاد پڑتا کہ ابا جان نے کبھی کسی بات پر ڈانٹ ڈپٹ کی ہو۔ گھر کا ایک مخصوص ماحول تھا جو ظاہر ہے کہ ابا جان نے سیٹ کیا ہوا تھا اور ہم سب اس ماحول کے مطابق ڈھلتے چلے گئے۔ اگر کبھی ہم سے کوئی ایسی غلطی سرزد ہو جاتی جس پر ہم توقع کر رہے ہوتے تھے کہ ابا جان سے ڈانٹ پڑے گی تو بھی ان کی طرف سے ناگواری کا اظہار صرف چہرے کے تاثرات سے ہوتا اور ہم سمجھ جاتے تھے کہ آئندہ یہ غلطی نہیں کرنی۔ شاذ ہی ابا جان نے کبھی بول کر ناگواری کا اظہار کیا ہو!

ہمارے گھر میں بچوں کے رسالے جیسے پیغام، پھول اور تعلیم و تربیت باقاعدگی سے آتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی کئی اسلامی اور تحریکی رسائل تکبیر، ایشیا، جسارت، اردو ڈائجسٹ وغیرہ ابا جان نے لگوائے ہوئے تھے اور ہم سب بہن بھائی ان کے باقاعدہ قاری تھے۔ مطالعہ کی عادت ابا جان نے ہمیں بچپن سے ڈالی۔ لاہور میں کتاب میلہ اور نمائش کہیں بھی لگتی ہم سب بہن بھائیوں کو کتابیں خریدنے کے لیے ایک مخصوص بجٹ دیتے اور پھر کتابوں کا انتخاب ہمارے اوپر چھوڑ دیتے۔ ہم اپنی مرضی سے کتابیں خریدتے اور پھر گھر آ کر ابا جان سب کی کتابیں دیکھتے جس کا انتخاب پسند آتا اس کو شاباش ملتی تھی اور باقی بغیر کچھ کہے اور جتائے سمجھ جاتے کہ ابا جان کا پسندیدہ انتخاب کیا ہے۔

ہم بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں بھی ابا جان نے کبھی سختی سے کام نہیں لیا۔ ہم سب نے اپنی مرضی کے مضامین کا انتخاب کیا اور ابا جان نے اس انتخاب کو خوش دلی سے قبول کیا۔ اپنے تعلیمی سلسلے میں جو بات مَیں ہمیشہ بہت فخر سے یاد کرتی ہوں اور بتاتی ہوں وہ یہ ہے کہ جب مَیں نے پانچویں کلاس پاس کی تو ابا جان یونیسکو فیلوشپ پر آسٹریلیا گئے ہوئے تھے اور ہم گاؤں میں تھے۔ گاؤں میں کوئی ہائی سکول نہیں تھا اور قریبی شہر کے ہائی سکول تک روز پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ ڈر

یہ تھا کہ میرا تعلیمی سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔ ابا جان نے اپنے ماموں جان کو کہہ میرا داخلہ چھٹی کلاس میں بوائز سکول میں کروا دیا اور یوں میرا تعلیمی سلسلہ چلتا رہا۔ یہ واقعہ ان کی بیٹیوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں حساسیت کو ظاہر کرتا ہے۔

اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود ہم سب بہنوں کو سکول اور کالج سے پک اینڈ ڈراپ ہمیشہ ابا جان نے خود کیا۔ سکول سے لے کر یونیورسٹی تک میں جن اداروں میں بھی پڑھی، ابا جان کا تعارف وہاں پہلے سے موجود ہوتا تھا۔ سکول و کالج کی بہت سی اساتذہ ان کی شاگردہ تھیں اور یونیورسٹی کے کئی اساتذہ ان کے کولیگز اور کچھ شاگرد تھے، تو مجھے ہمیشہ ایک جانے پہچانے اور قابل فخر باپ کی بیٹی ہونے کی حیثیت میں محبت اور عزت حاصل رہی۔

میں اگر اپنے اور ابا جان کے درمیان تعلق کی بات کروں تو مجھے لگتا ہے کہ میں بچپن میں ان سے کچھ فاصلے پر رہتی تھی۔ مگر جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی، میری ابا جان سے محبت اور دوستی بھی بڑی ہوتی رہی۔ پچھلے بہت سے عرصے سے خاص طور پر میری شادی کے بعد مجھے لگتا تھا کہ ابا جان میرے سب سے زیادہ اچھے دوست ہیں اور بچوں میں، مَیں ان سے سب سے زیادہ قریب تھی۔ ہر ہفتے میں ابا جان سے ملنے لاہور سے جوہر آباد جاتی تھی۔ اور جن دنوں لاہور ہوتی تھی روزانہ دو تین دفعہ ٹیلی فون پر رابطہ ہوتا تھا جس میں گھر میں اور خاندان میں ہونے والے مختلف مسائل پر بات ہوتی۔ ابا جان اپنے احساسات بتاتے، مشورہ کرتے اور اسی طرح میں بھی اپنے گھریلو سے لے کر پروفیشنل معاملات تک ابا جان سے ڈسکس کرتی اور جہاں مشورہ ضروری ہوتا، مشورہ کرتی۔ میرے ہر دکھ، ہر پریشانی کا جواب اور حل ان کے پاس موجود ہوتا تھا۔

ابا جان کی تعلیمی خدمات اور مفکرانہ صلاحیتوں کا تو زمانہ معترف ہے۔ ان کے مضامین اور مقالہ جات ان کی ذہنی بیداری اور ناقدانہ صلاحیتوں کے غماز ہیں۔ اس موضوع پر ان کے دوست اور احباب اور ماہرین تعلیم بخوبی روشنی ڈال سکتے ہیں مگر میں ان کی شخصی خوبیوں کا تذکرہ ضرور کروں گی۔ ابا جان ہمیشہ سے ایک راست گو اور سچے آدمی کے طور پر جانے جاتے تھے۔ ہماری دادی جان ان کے بچپن کا جب بھی تذکرہ کرتی تھیں تو ایک واقعہ ضرور سناتی تھیں کہ وہ انہیں اور پھوپھی جان کو دو آنے دیتی تھیں اور ساتھ ایک کٹوری، اور کہتیں کہ فلاں دکان پر جاؤ اور ایک آنے کا کڑوا شربت لے کر دونوں بہن بھائی وہیں دکان پر پی لینا۔ یہ دونوں بہن بھائی حسب ہدایت دکان

پر جاتے ایک ایک آنے کا شربت خریدتے اور وہیں دکان پر ہی پی کر واپس آ جاتے۔ دکاندار بڑا حیران ہوتا کہ جو کڑوا شربت بچے ماؤں کے ہاتھ سے نہیں پیتے یہ خود بخود کیسے پی لیتے ہیں؟ تو ایک دن دکاندار نے ابا جان سے پوچھا کہ یہ کڑوا شربت تم کیسے خود بھی پی لیتے ہو اور بہن کو بھی پلا لیتے ہو؟ تو ابا جان نے کہا: یہ میری ماں کی ہدایت ہے اور گھر واپس جاؤں گا تو وہ پوچھیں گی کہ شربت پیا کہ نہیں؟ اور میں جھوٹ نہیں بول سکتا اس لیے خود بھی پی لیتا ہوں اور بہن کو بھی پلاتا ہوں۔

ابا جان وضعداری، لحاظ، مروت، مہمان نوازی، غریب پروری، جرأت و بہادری کا مرقع تھے۔ وضع داری، لحاظ اور مروت ایسی کہ جو معاملات اوائل عمری میں اپنے قریبی رشتے داروں سے جس طرح طے ہوئے تھے ان کو عمر بھر نبھایا اور کبھی پلٹ کر پوچھا، نہ شکایت کی۔ بلا کے مہمان نواز تھے۔ ہمارے بچپن میں مجھے یاد ہے کہ ہمارا بہت چھوٹا سا دو کمروں کا گھر تھا لیکن شاید ہی کبھی ایسا ہوا کہ ہمارا گھر مہمان سے خالی ہو۔ جگہ کی تنگی مہمان نوازی میں کبھی آڑے نہ آئی۔

احباب و اقارب کے کتنے ہی لڑکوں نے ہمارے گھر میں رہ کر تعلیم حاصل کی اور یہ سب ابا جان کی ذاتی دلچسپی اور توجہ سے ہوتا تھا۔ یہ روایت ہمیشہ سے ہمارے گھر کا حصہ رہی مثلاً ہمارے دادا جان جو خود ایک سکول ٹیچر تھے غریب بچوں کو اپنے گھر میں رکھ کر تعلیم دلاتے تھے۔ اور پھر ہمارے ابا جان نے اس روایت کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ جلا بخشی۔

اپنی جرات و بہادری کے سبب غلط بات کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ ہمیشہ کلمۂ حق کہا اور اس کے نتیجے میں کبھی ترقی روکی گئی، کبھی تبادلے ہوئے، کبھی پوزیشن چھین لی گئی مگر اس طرح کا کوئی بھی حربہ انہیں جھکا نہیں سکا۔ ابا جان کی وفات پر ان کے ایک دوست نے تعزیت کرتے ہوئے کہا ملک صاحب نے دولت نہیں کمائی مگر عزت کمائی ہے اور یہی بات ہمارے لیے قابل فخر ہے۔

ہمارے ابا جان نے ایک نہایت جاندار اور شاندار زندگی گزاری۔ وہ اپنی اولاد کے لیے فخر کے بہت سے پہلو چھوڑ کر گئے ہیں اور اللہ رب العالمین سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ان کے نام کو بلند کرنے کی توفیق دے۔

صبر و برداشت کا جو معیار میں نے اپنے ابا جان میں دیکھا، بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ اپنے آخری ایام میں بھی جب ان سے پوچھتے کہ کہیں درد ہے یا تکلیف ہے تو ہمیشہ انکار میں سر

ہلاتے۔اس سے پہلے بھی جب کبھی بیمار پڑتے اور ان سے پوچھتے تو ہمیشہ کہتے مجھے کیا ہوا ہے؟ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ ۸/ اکتوبر کو ہونے والا فالج اٹیک اور پھر ڈینگی بخار اس دنیائے فانی سے ابا جان کی رخصت کا سبب بنا۔ بے شک ہم سب اللہ کی طرف سے ہیں اور سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

ابا جان کی وفات سے صرف ڈیڑھ گھنٹہ پہلے جب میں ان کے پاس کھڑی سورہ تغابن کی تلاوت کر رہی تھی، ان کا بلڈ پریشر، دل کی دھڑکن اور آکسیجن لیول ڈراپ ہونا شروع ہوا تو میں نے باہر آکر حسیب کو بتایا اور وہ بھاگ کر کنسلٹنٹ کے پاس گیا۔ دماغ کہہ رہا تھا وقت رخصت قریب ہے اور دل کسی معجزے کا منتظر تھا مگر معجزے بھی تب ہوتے ہیں جب اللہ چاہے۔ اس آخری وقت میں بھی ابا جان کے چہرے پر تکلیف کے آثار نہیں تھے بلکہ پرسکون چہرے کے ساتھ ایک نفس مطمئنہ اپنے رب کے حضور پیش ہونے کے لیے تیار تھا اور کیوں نہ ہوتا انہوں ہمیشہ ایک بہت صاف ستھری اور اجلی زندگی اپنے رب کے احکامات کے مطابق گزاری تھی۔ کنسلٹنٹ سے مل کر آنے کے بعد حسیب ہم بہنوں کو کہنے لگا کہ آپ لوگ گھر چلے جائیں اور میں یہ جانتے ہوئے بھی کہ ابا جان کا وقت رخصت قریب ہے، انہیں ان کے رب حوالے کر کے یہ سوچ کر چھوٹی بہنوں کو لے کر گھر آ گئی کہ میرا اکلوتا بھائی اس وقت ہمیں سنبھالے گا کہ ابا جان کو۔ دل کو یہ بھی تسلی تھی کہ بھائی ہسپتال میں اکیلا نہیں ہے میرے شوہر صفدر صاحب اور ہمارے کزن ظہیر اور منیر بھائی بھی حسیب کے ساتھ تھے۔ ہمارے گھر پہنچنے کے پون گھنٹے بعد ابا جان کی اس دنیائے فانی سے رخصت کی خبر آ گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ندا فاضلی نے اپنے والد کی وفات پر ایک نظم لکھی تھی چند دن پہلے کسی دوست نے ابا جان کی وفات پر پُرسا دیتے ہوئے یہ نظم بھیجی تو ایسے لگا کہ میرے جذبات کی عکاسی ہے۔ چند تبدیلیوں کے ساتھ حاضر ہے۔

تمہاری قبر پر
میں فاتحہ پڑھنے نہیں آیا
مجھے معلوم تھا تم مر نہیں سکتے
تمہاری موت کی سچی خبر جس نے اڑائی تھی

وہ جھوٹا تھا

وہ تم کب تھے؟

مری آنکھیں

تمہارے منظروں میں قید ہیں اب تک

میں جو بھی دیکھتا ہوں، سوچتا ہوں

وہ وہی ہے

جو تمہاری دنیا تھی

کہیں کچھ بھی نہیں بدلا

تمہارے ہاتھ میری انگلیوں میں سانس لیتے ہیں

میری آواز میں چھپ کر

تمہارا ذہن رہتا ہے

تمہاری قبر پر جس نے تمہارا نام لکھا ہے

وہ جھوٹا ہے

تمہاری قبر میں مَیں دفن ہوں

تم مجھ میں زندہ ہو

ابا جان کی وفات ہمارا بہت بڑا ذاتی صدمہ تو ہے ہی مگر میں سمجھتی ہوں کہ یہ ایک قومی نقصان بھی ہے۔ یہ ہمارے مردہ تعلیمی نظام کے ایک نوحہ گر کی وفات ہے، جو صرف نوحہ گری نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی بہتری کے لیے بھی کوشاں رہتے تھے۔ باپ کی کمی کسی بھی اور رشتے سے پوری نہیں ہوسکتی اور اس کمی کا درد اب ہم نے مرتے دم تک سہنا ہے ؎

مَیں جب ماحول میں تیری کمی محسوس کرتی ہوں
تھکی آنکھوں کے پردے میں نمی محسوس کرتی ہوں

یادرفتگان　　عبدالحسیب مجاہد[1]

اپنی کہانی کیسے کہیں؟

دلِ امید توڑا ہے کسی نے
سہارا دے کے چھوڑا ہے کسی نے

نہ منزل ہے نہ منزل کا نشاں ہے
کہاں پہ لا کے چھوڑا ہے کسی نے

شبِ غم کی سحر نہیں ہوتی
ہو بھی تو اب میرے گھر نہیں ہوتی

۸/اکتوبر جمعہ کا دن تھا میں جوہر آباد میں اپنے معمولات کے بعد نماز جمعہ اور کھانے سے فارغ ہو کر کچھ دیر لیٹ گیا۔ ارادہ تھا کہ عصر کے بعد نزدیکی شہر قائد آباد جاؤں گا۔ الخدمت فاؤنڈیشن کے ایک دوست حادثے میں زخمی تھے ان کی عیادت مقصود تھی۔ آنکھ موبائل فون کی گھنٹی سے کھلی۔ دوسری جانب لاہور سے منیر بھائی تھے۔ حال احوال کے بعد انہوں نے بہت احتیاط اور دھیمے انداز سے بتایا کہ ہم اس وقت چاچا جی پروفیسر محمد حسین صاحب کو لے کر ہسپتال آئے ہوئے ہیں انہیں نماز جمعہ کے بعد ہلکا سا فالج اٹیک آیا ہے۔

بے ترتیب دھڑکن اور برستی آنکھوں سے گھر میں موجود بہن، اہلیہ اور دیگر لوگوں کو بتایا اور لاہور روانگی کی تیاری کرنے لگا۔ ابو کے کزن فاروق صاحب جو ہمیشہ سگے چچا سے بڑھ کر ہم سب کا خیال رکھتے ہیں (ابو اور ہماری پھپھو بس ایک ہی بہن بھائی تھے) ان کے ہمراہ آدھے گھنٹے میں گھر سے نکل آئے۔ دھندلائی آنکھیں اور بے ترتیب سانسیں ڈرائیونگ کو مشکل بنا رہی تھیں اور اڑ کے لاہور پہنچ جانے کی شدید خواہش دماغ پر مسلط تھی۔ اس دوران لاہور رابطہ رہا۔ صفدر بھائی (ابو کے بھانجے اور بڑے داماد) اور منیر بھائی (ابو کے منہ بولے لیکن سگے بھائیوں سے بڑھ کر کیپٹن عادل شاہ صاحب کے بیٹے اور میرے برادر بزرگ) دو بہنیں اور دیگر لاہور میں موجود

---

[1] ملک صاحب مرحوم کے اکلوتے صاحبزادے

عزیز واقارب ہسپتال میں تھے۔اسی دوران فیصلہ کر کے ابو کو حمید لطیف ہسپتال شفٹ کروا دیا گیا کہ ابتدائی انجیکشن سروسز ہسپتال کی ایمرجنسی سے لگ گئے تھے لیکن بہتر care کے لیے نسبتاً بہتر facility پر جانا ضروری تھا۔

۸ بجے جب میں حمید لطیف ہسپتال کی ایمرجنسی میں پہنچا تو اللہ نے ہمت دی۔قائم ضبط کے ساتھ ابو کو بیڈ پر لیٹے گلے ملا۔انہوں نے جو ہر آباد گھر میں موجود سب کا حال احوال معلوم کیا اور خواہش ظاہر کی کہ اگر medicine تجویز ہوگئی ہے تو اب گھر چلا جائے۔سینئر کنسلٹنٹ نیورو فزیشن ڈاکٹر عدنان حمید گل آئے اور تجویز دی کہ چونکہ فالج بائیں جانب ہے تو بہتر ہے ۲۴ سے 48 گھنٹے ہسپتال گزاریں۔damage زیادہ نہیں ہے،الحمدللہ۔آٹھ دس دن میں بحالی کے واضح آثار اور ایک ماہ تک ان شاءاللہ مکمل بحال ہو جائیں گے۔

پریشانی قدرے کم ہوگئی اور اسے اللہ کی طرف سے آنے والی ایک ہلکی آزمائش جان کر سب بہن بھائی دعا گو ہو گئے کہ اللہ ابو کو خیریت سے گھر لائے اور پھر انشاءاللہ مکمل صحت بحالی کی طرف سفر شروع ہو۔

ہسپتال میں پہلی رات سے ہی بخار محسوس ہوا۔اگلے دن ٹیسٹ سے پتہ چلا کہ ڈینگی کی انفیکشن ہے۔ڈاکٹرز نے گمان ظاہر کیا کہ ڈینگی شاید فالج اٹیک سے دو دن پہلے کا ہے لیکن اپنے اثرات آہستہ آہستہ واضح کر رہا ہے۔ہسپتال کے تمام سینیئر کنسلٹنٹ ڈاکٹر عدنان حمید نے اپنے مشاورتی پینل میں شامل کر لیے۔دیگر کئی ڈاکٹرز جو فرینڈز اور فیملی سرکل میں تھے ان سے بھی مشاورت ہوئی اور یہی طے ہوا کہ جب تک ڈینگی سے مکمل صحت یابی نہیں ہوتی تب تک ہسپتال میں ہی رہنا چاہیے۔

علاج شروع ہوا اور مثبت آثار نمایاں تھے۔ڈینگی جسم کے مختلف اہم اندرونی اعضاء دل، گردہ، جگر کی کارکردگی پر اثر انداز ہو رہا تھا لیکن ہر منفی اثر اگلے دن مثبت جانب آ جاتا۔چھٹے ساتویں دن تک جب واضح بہتری نہ ہو سکی تو تشویش بڑھنے لگی۔اس دوران ابو کے جملہ حلقہ احباب میں ان کی بیماری کی خبر پھیل چکی تھی جو کہ ابتدائی دنوں میں صرف ان کے انتہائی قریبی دوستوں تک محدود تھی۔

ہر گزرتا دن دعائیں کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہی لا رہا تھا۔ تنظیم اساتذہ، جماعت اسلامی اور ابو کے حلقہ احباب میں ہر طبقہ فکر سے تعلق رکھنے والے لوگ روز کسی نئے فورم، نئے پلیٹ فارم پر کی گئی اجتماعی دعا کا بتاتے۔ بلا مبالغہ روزانہ سینکڑوں فون کالز ابو کے مخلص اور قریبی دوستوں کی آنسوؤں اور سسکیوں سے بھری دعائیں ہم سب اہل خانہ کی امید بڑھا دیتیں۔ خاندان کے سب افراد اور بالخصوص ہم بہن بھائی اس پریشانی کے عالم میں اپنے والدین ہی کی تربیت کے سبب ناامید ایک لمحے کے لیے بھی نہیں تھے۔ دعائیں آنکھوں، زبان اور دل و دماغ سے سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے ہر لمحہ جاری تھیں۔ ہماری زندگی میں پہلی دفعہ ایسا ہوا کہ ابو کسی مشکل بیماری کی لپیٹ میں اور ہسپتال کے بیڈ پر تھے۔ ہر دن دل چاہتا تھا کہ آج کا دن ہی ان شاء اللہ ابو کی صحت کا دن ہو۔

روز عیادت اور ہماری تسلی کے لیے ابو کے دوست، میرے اپنے احباب، دیگر عزیز و اقارب اور ابو کے تحریکی ساتھی سب ہسپتال آتے، ہماری پریشانی بانٹتے اور دعاؤں کا پلڑہ بھاری کرتے۔ ڈینگی جسم میں مختلف قسم کی انفیکشن پیدا کر رہا تھا، ابو اور ڈاکٹرز مقابلہ کیے جا رہے تھے۔

اللہ نے خاص مہربانی سے ایسے رشتے داروں اور قرابت داروں سے نوازا ہے کہ مشکل وقت میں سب ساتھ موجود ہوتے ہیں۔

ابو کے احباب میں آنے والے سب لوگ ہماری ہی طرح اس دکھ میں تھے کہ ساری زندگی انہوں نے ابو کو صحت، تندرستی اور مثبت سرگرمی میں مصروف دیکھا ہے، مرکزِ محفل بنتے دیکھا ہے، ہسپتال کے کمرے میں بیڈ پر لیٹے دیکھنا اور ان کی شدید کمزوری جو ڈینگی اور فالج کے مل جانے سے ہوئی، کے باعث ان کا باقاعدہ گفتگو نہ کر پانا، سب کی برداشت کا سخت امتحان تھا۔

فالج یا کمزوری کا اثر دماغ پر بالکل نہیں تھا۔ ابو سب ملنے کے لیے آنے والوں سے ملتے اور ہمیں ان کی میزبانی کا حکم دیتے۔

دن گزرتے چلے جا رہے تھے۔ پریشانی جوں کی توں تھی کہ بہتری کے واضح آثار نہیں آ رہے۔ اگر صبح کی رپورٹس میں بہتری آتی تو شام والے ٹیسٹ پھر پریشان کر دیتے۔

میں اور بھائی ڈاکٹر ظہیر حسین شاہ (بزرگ چچا جان مرحوم کیپٹن عادل شاہ صاحب کے چھوٹے بیٹے) نے مختلف ذرائع سے کئی سینئر ڈاکٹرز سے مشاورت کی۔ صورتحال، رپورٹس اور علاج ڈسکس کیا تو یہی معلوم ہوا کہ علاج کی سمت درست ہے بس اللہ کی طرف سے شفا ملنے میں دیر ہے۔

دن بڑھ رہے تھے تو دعاؤں کی شدت کے ساتھ ابو کی صحت کا انتظار رویے میں تھوڑا تھوڑا اللہ سے شکوہ بھی لا رہا تھا۔ ہسپتال سے جب کچھ دیر سونے گھر جاتا تو اپنے کمرے میں اکیلے اللہ سے شکوہ بھی کر لیتا کہ یا اللہ میں تو گناہ گار سہی پر آپ تو پروردگار ہیں اور میں اکیلا تو نہیں ہزاروں لوگ جو ہمارے ساتھ دعاؤں میں شامل ہو چکے ہیں، پلیز ہماری دعائیں قبول کر لیں اور ابو کو صحت و تندرستی عطا کر دیں۔

ابو کو ہسپتال میں انیسواں دن تھا جب رپورٹس میں ظاہر ہوا کہ انفیکشن کا شدید اٹیک پھیپھڑوں پر ہوا ہے۔ ڈاکٹرز نے مشاورت کی اور آئی سی یو شفٹ کر دیا گیا۔ پریشانی بڑھ گئی، ضبط یوں ٹوٹ رہا تھا کہ آنکھیں آنسوؤں سے تر ہی رہتی تھی لیکن اللہ سے امید قائم تھی۔ ایک لمحے کے لیے بھی ایسا نہیں لگتا تھا کہ ابو صحتیاب نہیں ہو گے۔ دل کی یہ خواہش کہ ابو صحت یاب ہوں اور اپنی پرانی روٹین پر واپس آئیں، دماغ پر بھی یوں گرفت کر رکھی تھی کہ ڈاکٹرز جو پہلی بار انیسویں دن ہم سے نظریں چرا کر Negative Counseling کر رہے تھے، بھی میرے دل میں یہ شائبہ نہ ڈال سکے کہ صورت حال بدل رہی ہے۔ دو دن اسی کیفیت میں گزرے اور ۲۹ اکتوبر آ گیا۔ روٹین تھی کہ رات دو تین بجے گھر جاتا اور صبح نو بجے واپس اسپتال پہنچ جاتا۔ اس دوران فاروق صاحب (ابو کے کزن) اور دیگر کزنز ہسپتال میں ہوتے (اللہ انہیں اپنی عافیت اور برکات سے نوازے)۔ 29 اکتوبر کی صبح جب ہسپتال گیا تو ابو کی کیفیت پچھلے دن جیسی ہی تھی۔ تقریبا بے ہوشی، مصنوعی تنفس اور بلڈ پریشر کنٹرولر اٹیچ تھا۔ مشین ریڈنگز نارمل رینج میں تھیں۔ اس دن صبح سے شام تک سب ریڈنگز نارمل رینج سے نیچے آنے لگیں۔ ڈاکٹرز بے بس تھے کہ آکسیجن اور بلڈ پریشر کنٹرولر اپنی پوری capacity پہ چل رہے تھے۔ دل بجھتا جا رہا تھا۔ دماغ سن ہو رہا تھا۔ پورا وجود دعا گو تھا۔

شام کے بعد تقریباً سات بجے ڈاکٹرز نے مجھے بلوایا اور کہا کہ اس صورتحال کو ہم کنٹرول نہیں کر پا رہے۔ مایوس نہیں لیکن دعا گو ہیں کہ اللہ اس بگڑتی صورتحال کو بدل دے۔

سوا آٹھ بجے کے قریب دوبارہ مجھے آئی سی یو میں بلوایا گیا اور ڈاکٹر نے کہا کہ آپ یہیں اپنے ابو کے پاس رکیں۔ کزن محبوب الحسن بھی اندر ہی رک گیا۔ دیگر سب افراد باہر ہی تھے۔ گھر کی خواتین شام کو ہی ابو کومل کے گھر جا چکی تھیں۔ مشین ریڈنگز دیکھ کر دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ کزن کو میں نے کہا کہ میں سورۃ یاسین پڑھنے لگا ہوں، آپ بھی سورۃ یاسین پڑھیں۔ میرے دوسری دفعہ سورۃ یاسین پڑھنے کے دوران بلڈ پریشر ریڈنگ زیرو ہوئی۔ تیسری دفعہ سورۃ یاسین شروع کی تو ہارٹ کی ریڈنگ زیرو پر آ گئی۔ اور چند لمحے بعد آکسیڈیشن بھی زیرو ہو گئی۔ کامل ایمان کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، دل و دماغ پر چھا چکا تھا۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعونَ.

21 دن نہ رکنے والے آنسو مَیں نہیں جانتا کیسے رک گئے۔ دل، دماغ کو سمجھا رہا تھا کہ اللہ کی رضا کے آگے یونہی بے بس ہیں ہم۔ اللہ کی رضا قبول کی۔

آنکھیں گواہ ہیں کہ اللہ نے کس خاموشی اور عافیت سے ابو کو اِس جہاں سے اُس جہاں میں منتقل کر دیا۔ باوقار زندگی، باوقار انتقال۔

جو جانتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ابو نے روشن کردار کے ساتھ بہترین پاکیزہ زندگی گزاری۔ ان کی صحت کے لیے ہونے والی بے شمار دعائیں شاید اس لیے بھی قبول نہیں ہوئیں کہ اللہ نے ان کا بدل ابو کو جنت میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجات پر لے جا کر دینا ہوگا۔ اللہ انہیں جنت کے باغوں کا مکین کرے، آمین

ابو کا حلقہ احباب بے حد وسیع تھا۔ گو کہ فطری طور پر قریب ترین، قریب اور تحریکی ساتھیوں پر مشتمل ہے لیکن مَیں دانستہ کوئی بھی نام لکھنے سے گریز کر رہا ہوں کہ دعاؤں میں سب ہی ہمارے ساتھ شریک تھے۔ گستاخی ہوگی کہ چند نام لکھوں اور دیگر افراد کا تذکرہ نہ ہو۔ صرف ایک بے حد قابلِ احترام اور میرے بزرگ ڈاکٹر مشتاق الرحمن صدیقی صاحب نے میرا ضبط بھی توڑ دیا جو ابو

کے چلے جانے کے اگلے لمحے سے خود پہ طاری کیے ہوئے تھا۔ اس قدر روئے اور رلایا کہ میں خود ڈر گیا کہ اے اللہ! میرے ان محترم بزرگ کو اس صدمے سے بحفاظت باہر نکالنا۔ اس سانحہ پر ہمارے دکھ بانٹنے پورے پاکستان سے لوگ سفر کر کے ہمارے آبائی گاؤں سندرال ضلع خوشاب ہمارے پاس آئے۔ اللہ ان سب لوگوں اور ان کے اہل خانہ کی زندگیاں برکتوں اور رحمتوں سے بھر دے جو تشریف لائے، ٹیلیفونک تعزیت میں شامل ہوئے یا کسی بھی طرح ہمارے اس صدمے میں رابطے میں رہے۔

مختلف شعبہ ہائے زندگی سے نمایاں لوگوں کی جانب سے مختلف فورمز اور سوشل میڈیا پر ابو کے انتقال پر اظہار افسوس پہنچانے والے سب پر خلوص احباب کا ممنون ہوں۔ اللہ آپ کو بہترین صحت اور برکت کے ساتھ سلامت رکھے۔ ابو نے زندگی کی 79 بہاریں وخزائیں عافیت اور صحت کے ساتھ دیکھیں۔ خوشاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں سندرال، ایک باعمل مسلمان اور علمی خاندان سے تعلق۔ مختصر خاندان ابو اور ابو کی ایک ہی بہن جو پہلے ہی وفات پا چکیں۔ آباواجداد میں یا دینی تعلیم دینے والے تھے یا دنیاوی، تعلق بہرصورت تعلیم سے ہی تھا۔ ابو کے بزرگوں میں کچھ فارغ التحصیل دیوبند، تو میرے دادا اور ابو کے والد محترم قاضی محمد عبداللہ صاحب کی طرح علوم ریاضی اور دیگر معاشرتی علوم کے سند یافتہ۔

میرے دادا کی وفات ۱۹۴۸ء میں ہوئی جب ابو صرف ۶ سال کے تھے۔ ابو کی تعلیم و تربیت میں بنیادی کردار ان کے ماموں استاد امیر حسین صاحب کا تھا جو ۴۶ سال ضلع خوشاب میں ہی سکول مدرس رہے۔ ان کے ساتھ شامل میرے ابو کے منہ بولے بھائی کیپٹن عادل شاہ صاحب (جن کی تربیت ان کے والدین کی وفات کے بعد میرے دادا کی ذمہ داری رہی۔ کیپٹن عادل شاہ صاحب ساری زندگی بہترین طور پر ہمارے سگے چچا کا تعلق نبھاتے رہے۔ 92 سال عمر پائی اور ۲۰۲۰ء میں اپنے رب کے حضور پہنچ گئے۔ اللہ انہیں جنت میں اعلیٰ درجوں میں مقام سکون عطا فرمائے۔ ان کے بیٹے میرے برادر بزرگ منیر حسین شاہ صاحب اور حافظ ظہیر حسین شاہ صاحب نے زندگی بھر سگے بھائیوں والا رشتہ رکھا ہے۔ اللہ انہیں صحت اور عافیت کے ساتھ سلامت رکھے)۔ ابو نے تعلیمی سفر گورنمنٹ ہائی سکول خوشاب سے شروع کیا۔ سرگودھا کالج اور

پنجاب یونیورسٹی لاہور کے بعد ماسٹرز امریکن یونیورسٹی آف بیروت لبنان، پھر پوسٹ گریجویشن موناش یونیورسٹی آسٹریلیا سے کی۔ دوران سروس یونیورسٹی آف لیور پول انگلینڈ سے سرٹیفکیشن کیں۔

سرکاری ملازمت بطور سائنس ٹیچر شروع کی لیکن جلد ہی کالج لیکچرر ہو گئے۔ آسٹریلیا سے واپس آئے تو پنجاب یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے۔ دورانِ تعلیم بیرون ملک بے شمار آفرز ٹھکرائیں کہ اپنا خاندان، اپنا ملک، اپنے لوگ ترجیح تھے۔

۱۹۸۸ء سے ابو کی خدمات گورنمنٹ آف پنجاب کو منتقل ہوئیں۔ اس کے بعد ریٹائرمنٹ تک ہمیشہ اعلی انتظامی عہدوں پر رہے اور اپنا ایک منفرد تشخص قائم کیا۔

دوران سروس ابو کی پہچان درست اور بروقت فیصلہ کرنے والے لیڈر اور رزق حلال پر سختی سے کاربند رہنے والے سرکاری آفیسر کی تھی۔ ۵۸ سال کی عمر میں ریٹائرمنٹ لے لی۔ تب صوبائی حکومت میں ۲۰ ویں گریڈ کی بھی لاسٹ سٹیج پر شعبہ تعلیم کے parent ادارے ڈائریکٹوریٹ آف سٹاف ڈویلپمنٹ کے سربراہ تھے۔ ریٹائرمنٹ کا مقصد تحریکی کمٹمنٹس تھیں۔ پرائیویٹ سیکٹر میں کئی ادارے بنیاد سے شروع کر کے بلندی تک لے گئے مثلاً AFAQ وغیرہ۔

حرا اسکولز پاکستان کا انتظام و انصرام سنبھالے رکھا۔ کئی تحریکی کاموں کے معاون رہے۔ تحقیق و تحریر پر بہت وقت صرف کیا۔ ہزاروں تحاریر ملکی اور غیر ملکی سطح پر شائع کیں۔ آٹھ اکتوبر کو جس دن بیمار ہوئے اس دن بھی دوپہر ۳ بجے سنگل نیشنل کریکولم پر ڈاکٹر محمد امین صاحب کے ہمراہ ایک پروگرام میں شرکت کے لیے جانا تھا کہ اس سے ایک گھنٹہ قبل دوپہر ۲ بجے فالج اٹیک نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

بے تحاشہ مصروف زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ ابو نے گھر کو ہمیشہ مکمل وقت دیا۔ معروف عام بات یہ ہے کہ باپ اپنے بیٹے کا پہلا ہیرو ہوتا ہے۔ میرے پہلے بھی اور آخری بھی صرف ہیرو نہیں سپر ہیرو ابو ہی تھے۔ ہمارے درمیان تعلق صرف باپ اور بیٹے کا نہیں تھا، دوستی اور بے تکلفی بھی تھی۔ دوران سفر یا بعض اوقات دفتر میں بیٹھے ہم بلا تکان گھنٹوں ان موضوعات پر گفتگو کر لیتے تھے جو عموماً باپ بیٹے نہیں کیا کرتے۔

تین بہنیں اور میں ایک بھائی ابو کے لیے سب برابر تھے۔ ابو نے ہمیشہ ایک خاص سلیقے سے ہمیں یہی احساس دلایا کہ بیٹا اور بیٹی دونوں ان کے لیے یکساں اہم اور پیارے ہیں۔

میں چھوٹا سا تھا تو تب سے اپنے احباب کی محافل میں ساتھ لے جاتے۔ لاہور والے گھر ابو کے سب قریبی احباب بہت آتے جاتے تھے تو سب لوگوں سے تعلق اور وابستگی ہے۔

ہم بہن بھائی کبھی معمولی موسمی بیماری میں بھی مبتلا ہوتے تو ابو ہماری والدہ صاحبہ کے ساتھ مل کر ہمارا بے حد خیال رکھتے اور ہمارے صحت مند ہو جانے تک پریشانی ان کے چہرے سے جھلکتی۔

میں چار پانچ سال کا تھا جب ایک دن میرا بلا (BAT) ٹوٹ گیا۔ جمعہ کا دن تھا، تب جمعہ کے دن چھٹی ہوتی تھی، مگر ابو کسی کام سے دن بھر باہر تھے۔ عصر کے بعد گھر آئے تو میں نے ان سے کہا کہ میرا بلا (BAT) ٹوٹ گیا ہے، مجھے نیا لینا ہے اور ابھی لینا ہے۔ صرف ایک بار مجھے اچھی طرح یاد ہے صرف ایک بار ابو نے کہا کہ بیٹا آج جمعہ ہے اور عصر کا وقت ہے تو دکانیں سب بند ہوں گی۔ دوسری دفعہ یہ بات ابو نے نہیں کہی میرا چہرہ دیکھا، موٹر سائیکل ہوتا تھا تب ابو کے پاس، فوراً نکالا مجھے بٹھایا اور نکل پڑے۔ کلفٹن کالونی لاہور والے گھر سے اچھرہ تک ہر وہ دکان جہاں امکان تھا کہ بلا (BAT) مل سکے رکے، مجھے دکھایا کہ دیکھو دکان بند ہے پھر آگے چلتے اور آخر اچھرہ پہنچ گئے۔ وہاں جب میں نے خود کہا کہ گھر واپس چلیں۔ آج تو کوئی دکان بھی کھلی نہیں تب واپس گھر لے آئے۔

ایسے تھے میرے ابو۔۔۔۔اور ایسی تھی ان کی محبت۔

ابو کے چلے جانے کے تیسرے دن مجھے اپنے گاؤں میں گھر کے پاس گلی میں ایک بوڑھی خاتون نے روکا۔ اظہار افسوس کے بعد کہنے لگی محمد حسین میرے بھائیوں جیسا تھا۔ مَیں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی اسے گلی میں نظر اٹھا کے چلتے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ نظریں نیچی رکھ کے چلتا تھا۔ اللہ اسے اس کے اعلیٰ کردار کے بدلے جنت کا بہترین مقام عطا کرے۔

ابو کا عمومی مزاج بہت معتدل تھا۔ چاہے دینی حوالے سے دیکھیں یا دنیاوی حوالے سے۔ دینی اعتبار سے فرائض، قرآن وحدیث، معاملاتِ زندگی میں شفافیت کے قائل لیکن دین میں سختی

اور متشدد رویوں کے سخت ناقد۔

دنیاوی اعتبار سے معاشی استحکام کے قائل لیکن لالچ، نمود و نمائش اور پیسے کے اسراف کے سخت مخالف۔

ابو کی ساری زندگی درس و تدریس، انتظامی امور، لکھنے لکھانے میں گزری لیکن اس کے ساتھ وہ کبھی خشک مزاج نہیں تھے۔ اچھی شاعری، اچھا مزاح، اچھی تحریر، تصویر ہمیشہ ان کی دلچسپی رہی۔ معروف مزاحیہ ٹی وی اداکار معین اختر صاحب کے انتقال پر بے حد افسردہ رہے کہ ٹی وی پر وہی تو معیاری مزاح کے علم بردار تھے۔

انور مقصود صاحب کے مداح تھے۔ مزاحیہ شاعری میں انور مسعود اور خالد مسعود خان کو بہت پسند کرتے تھے۔

ابو کی ذاتی لائبریری تین ہزار سے زائد انتہائی اعلیٰ اور نایاب کتب پر مشتمل ہے جس میں تعلیم سے لے کر معاشیات تک، ایڈمنسٹریشن سے اکنامکس، مذہب، تفاسیر، احادیث، سیرت النبی اور دیگر موضوعاتِ زندگی پر شاندار کتب موجود ہیں۔

ہمیشہ اپنے دوستوں کی خیریت، بیماری، پریشانی کے معاملات سے واقف اور دعا گو رہتے تھے۔

پچھلے کچھ عرصے میں پے در پے ابو نے اپنے قریبی لوگوں کو اللہ کے پاس واپس جاتے دیکھا ایسے اوقات میں باقی سب کو جذباتی سہارا دیتے۔ اللہ کی رضا پر راضی رہنے کی تلقین کرتے لیکن خود بے حد افسردہ رہتے۔

۲۰۱۶ء میں ابو کو اپنے ایک بہت پیارے بھانجے جو حادثے میں اچانک فوت ہوئے، اسے اپنی آنکھوں کے سامنے لحد میں جاتا دیکھنا پڑا۔

۲۰۱۷ء میں ہماری والدہ صاحبہ ابو کو ۴۸ سالہ رفاقت کے بعد جدائی کا صدمہ دے گئیں۔ طویل عرصہ بہت غمزدہ رہے۔ اسی غم سے شوگر کا عارضہ لاحق ہوا۔ گو کہ ہمیشہ ادویات سے کنٹرول رہی لیکن خود بھی حیران ہوتے تھے کہ یار مجھے اب ۷۵ سال کی عمر میں آ کے شوگر ہو گئی۔ میٹھا بہت

پسند کرتے تھے تو اس کے بعد بہت محتاط ہو گئے۔

ڈاکٹر حسن صہیب مراد صاحب سے ابو کا بہت لگاؤ اور قریبی تعلق رہا تھا۔ ان کی حادثاتی وفات سے بہت دن پریشان رہے۔ ان سے تعلق کی خوبصورت یادیں سنایا کرتے۔

۲۰۲۰ء اور ۲۰۲۱ء ابو کے لیے صدمات لایا۔ جون ۲۰۲۰ء میں ابو کے طویل اور محبوب ترین تعلق والے بزرگ بھائی کیپٹن عادل شاہ صاحب اللہ کے حضور پہنچے۔ ہمارے چچا جان کیپٹن عادل شاہ صاحب ایک باغ و بہار شخصیت تھے۔ ایک ایسا تناور درخت جس کی چھاؤں سے اپنے پرائے، دوست دشمن سبھی فیض یاب ہوئے۔ ایک شاندار زندگی کا باوقار انجام انہیں نصیب ہوا۔ اللہ انہیں جنت کے اعلیٰ درجوں کا مکین کرے۔

ڈاکٹر حافظ حمید اللہ جو ابو کو بے حد پیارے تھے کہ دونوں گھرانوں کا تعلق ہی ایسا ہے، ان کی اچانک وفات پر بہت دن ابو کی آنکھوں میں آنسوؤں کا عکس رہا۔ حافظ حمید اللہ صاحب کے والد محترم ابو کے عزیز دوست پروفیسر ملک محمد امیر اور میرے قابل احترام چچا جان کے لیے بے حد پریشان رہے اور اکثر ان کا ذکر رہتا۔

دو ماہ قبل ابو کے کولیگ، شاگرد اور قریبی دوست معروف ماہرِ تعلیم ڈاکٹر خالد محمود صاحب کینسر سے لڑتے اللہ کے پاس چلے گئے ابو اور ڈاکٹر خالد محمود صاحب میں بے حد احترام اور محبت کا رشتہ تھا۔ ان کی وفات پر پھر میں نے ابو کی آنکھیں بہت دن دھندلائی ہوئی پائیں۔

اللہ اپنے ان سب خوبصورت خوب سیرت لوگوں کو جنت کے باغوں میں رفیق بنائے اور جیسے ان کی محفلیں دنیا میں تھیں اسی طرح وہاں بھی یہ اپنی خوبصورت محفلیں سجائے رکھیں۔

اللہ نے مجھے ایک بیٹی اور بیٹے سے نواز رکھا ہے۔ بیٹی پیدا ہوئی تو میں نے لیبر روم سے اطلاع آتے ہی اعلان کر دیا کہ اس کا نام عائشہ نور العین ہوگا۔ کچھ دن بعد ابو نے گلہ کرتے ہوئے کہا: تم نے نام اچھا رکھا ہے لیکن کسی اور سے بھی پوچھتے گھر میں۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا کہ سنا تھا آپ نے اپنے بچوں کے نام اپنی مرضی سے رکھے تھے تو ہنسنے لگے۔ جب اللہ نے بیٹا دیا تو میں نے ابو سے کہا کہ اس کا نام اب آپ اپنی مرضی سے رکھیں۔ ابو نے اپنے پوتے کو عبداللہ حسین ملک نام دیا۔

پوتا پوتی جو اپنے دادا کے منظورِ نظر تھے اور دادا بھی ایسے جو ہر معاملے میں روایت شکن ہونے کے باوجود پوتا پوتی کو بے پناہ پیار دے کر بگاڑنے والی روایت پر مکمل کار بند۔ میرے بچوں کی خوش نصیبی کہ انہوں نے اپنے دادا کا بے حد پیار سمیٹا اور اللہ کا حکم کہ یہ بس مختصر وقت کے لیے ہی تھا۔

میں نے اپنے ابو کو معاشرتی، معاشی، ذہنی، جذباتی ہر اعتبار سے آسودہ دیکھا۔ اللہ نے ابو کو عزت، شہرت، فراخیٔ رزق اور سکونِ قلب سے بھرپور زندگی دی۔ تمام عمر کسی سخت بیماری میں مبتلا نہیں ہوئے۔ ۱۲ روزہ علالت جیسے اپنا مہمان بنانے کی تیاری، اور پھر اللہ نے اپنے پاس بلا لیا اور اللہ اپنے ایسے اعلیٰ بندوں کے لیے بہترین میزبان ہے۔

اولاد کے فرائض ابو نے بخوبی اور انتہائی احسن انداز میں نبھائے۔ ہم سب بہن بھائیوں کو بہترین تعلیم سے آراستہ کیا، شادیاں کیں اور ہمیشہ ہماری حفاظت کی۔

سب سے بڑی بہن پی ایچ ڈی ڈاکٹر ہیں، لاہور کالج فار وومین یونیورسٹی میں شعبۂ تدریس سے وابستہ ہیں۔ ان سے چھوٹی دو بہنیں پوسٹ گریجویٹ تعلیم لیکن گھریلو زندگی میں آسودہ۔

ان کے بعد میں درس وتدریس اور انتظامی امور سے وابستہ پی ایچ ڈی کا اندازاً ۶ ماہ کا کام باقی ہے۔ عملی زندگی میں مطمئن ہوں۔

بے شک ہم اس دنیا میں جانے کے لیے ہی آئے ہیں لیکن والدین کا رشتہ ایسا ہے کہ دل چاہتا ہے وہ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں اور اگر جدا ہو جائیں تو پیدا ہونے والے خلا کا کوئی بدل ممکن نہیں۔

اپنے لاہور والے گھر کے پاس واقعہ پارک اور گلیاں جہاں ابو کے ساتھ بہت واک کی، باتیں کیں، ان کا کمرہ، بیڈ، اور اس پر ابو اپنے پوتا پوتی سے کھیل میں مگن۔ ہمارے زیر انتظام تعلیمی ادارے میں ابو کا آفس وہاں ان سے دنیا جہان کے موضوعات پر کی گئی بحثیں اور گفتگو۔

ان کا لمس، ان کی قدرتی بے مثال مہک، ہسپتال کے دنوں میں گھنٹوں ان کا ہاتھ تھامے رکھنا اور ان کے بالوں میں انگلیاں پھیرنا، ان کا آنکھ کے اشارے سے بہت قریب ہونے کا کہہ کر بوسہ لینا۔

یہ سب دل ودماغ پر نقش ہے اور رہے گا۔ ابو اور جن اساتذہ کے پاس ابو نے بٹھایا، ان کی تربیت ہے کہ اللہ کی رضا کو قبول کرنا سیکھا ہے۔

۷۹ سالہ بے داغ زندگی، دامن پر ایک بھی دھبہ نہیں اور ان گنت گواہ کہ کردار کی پختگی جو پروفیسر محمد حسین ملک میں دیکھی وہ بے مثال ہے۔

تعزیت کے لیے آنے والوں کا Most Common Remark یہ کہ ہم نے ملک صاحب کو ہمیشہ لوگوں کو فائدہ پہنچاتے دیکھا۔ کبھی کسی کا نقصان کرتے سوچتے، یا بولتے نہیں دیکھا۔ جو مخالفتیں رکھیں بھی تو کبھی ذاتی مخالفت نہ تھی۔ صرف نظریاتی مخالفتیں، اور وہ بھی احترام سے نبھائیں۔ تنقید کی تو صرف نظریات کی بنیاد پر، شخصی بنیاد پر نہیں، ابو کے تمام پر خلوص احباب کی محبتوں کا ممنون ہوں۔ ان کے تمام احباب، روابط، تحریکی رفقاء میرے لیے بے حد قابل احترام اور انتہائی اہم ہیں۔ کسی بھی معاملے میں، ضرورت میں یا کسی بھی طرح سے میں آپ کے کام آ پاؤں تو یہ میرے لیے سعادت ہوگی۔ تحریر کے آخر میں اپنا رابطہ نمبر چھوڑوں گا۔ میں ایک بار پھر مکمل ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں کہ میرے والد کے روابط میں کبھی بھی کسی بھی طرح آپ کے کام آ سکوں تو اسے اپنے لیے سعادت سمجھوں گا۔ بلا تکلف رابطہ کر سکتے ہیں۔

اللہ سے ہر دم یہی دعا ہے کہ اللہ میرے شاندار اور پاکیزہ زندگی گزارنے والے والدین کو جنت میں اعلیٰ درجات سے سرفراز کرے اور ان کی وہ سب محبوب ہستیاں جو دنیا سے جا چکیں، جنت کی سیر میں ان کے ہمراہ ہوں۔

دعا ہے کہ اللہ ہم سے ایسے کام لے کہ ہم اپنے والدین کی جنت میں مزید بلندی درجات کا سبب بنیں، آمین۔ [موبائل 0333-4303083]

یادرفتگان　　سید امام شاہ[1]

میرا دوست محمد حسین

محمد حسین، پسماندہ گاؤں سندرال (ضلع خوشاب) کا باسی جو علمی وادبی حلقوں میں پروفیسر ملک محمد حسین کے نام سے جانا پہچانا گیا۔تحریک احیائے اسلام کا معاون و روح رواں۔ میرے نزدیک والدین کا عکسِ حیات اور اس جہاں میں حاصلِ حسنات۔

میں موصوف کے والد محترم استاد محمد عبداللہ صاحب مدرس مڈل ماڈل سکول کٹھہ سگھرال (ضلع خوشاب) سے مل تو نہیں سکا کہ موصوف کم عمری میں ہی دو کم سن بچوں کو چھوڑ کر خالق حقیقی سے جا ملے تھے اور میں اپنے دوست سے بھی چار سال کم عمر۔ البتہ ان کے عمل کی باقیات و صالحات سے ضرور ملا ہوں جن میں سے مَیں نے اکثر کو مدرس اور زندگی کے مختلف شعبوں میں کامیاب دیکھا۔ کئی یتیم و نادار انہی کے طفیل زندگی کے سفر میں کامیاب و کامران ہوئے اور عقیدت و مودت کا یہ رشتہ اس دارالحسنات سے آج تلک قائم و دائم رکھے ہوئے ہیں۔ مجھے کیپٹن عادل شاہ کے بیٹے واپڈا ایگزیکٹو آفیسر منیر حسین شاہ نے بتایا کہ ۹۴ سالہ والد کا وقت رحلت قریب آیا تو میں رونے لگا۔ والد نے دیکھا تو کہنے لگے: پگلے روتا کیوں ہے؟ ابھی تو پروفیسر محمد حسین زندہ ہے، یہ آنسو سنبھال کر رکھ۔ خدانخواستہ تیری زندگی میں یہ سانحہ ہوا تو جی بھر کے رونا۔

۱۹۵۸ء میں سندرال کا یہ پینڈو، کم گو اور کم آمیز ہائی سکول خوشاب کے اساتذہ کے نزدیک ایک متوسط درجے کی ذہانت کا حامل میٹرک کے امتحان کو ٹاپ کرتا سرگودھا کالج کو سدھارا تو اسی سال مجھے بھی یتیم و نادار ہونے کے ناطے اسی دارالسکون میں بغرض تعلیم و تربیت داخلہ ملا اور آج تلک یہ رشتہ قائم و دائم ہے۔

یہاں مجھے دو شخصیتوں کی صحبت سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا۔ ایک موصوف کے ماموں ملک امیر حسین صاحب جو بچپن سے ہی اس گھر سے منسلک ہو چکے تھے، یہیں پلے بڑھے، تعلیم

---

[1] ملک صاحب مرحوم کے بچپن کے دوست

حاصل کی، مدرس بنے اور استاد عبداللہ صاحب کی رحلت کے بعد ہمشیرہ اور اس کے بچوں کی کفالت کی ذمہ داری لے چکے تھے۔

میں اپنے محسن و مربی کے بارے میں یہاں کچھ نہیں کہوں گا کہ اگر ایسا کیا تو اصل موضوع سے ہٹ جاؤں گا۔صرف اتنا کہوں گا کے محسن مذکور ملازمت کے سلسلے میں ادھر ادھر سے پھرتے پھراتے ۱۹۵۷ء میں خوشاب ہائی سکول بطور ایس وی ٹیچر جوائن کر چکے تھے۔ روزانہ گھر سے بذریعہ سائیکل خوشاب آتے جاتے۔ ہم سب طالب علم یہی کرتے تھے، فاصلہ آٹھ کلومیٹر تھا، رابطہ سڑک ریلوے روڈ تھی۔ چونتیس سال اسی درسگاہ میں رہے، تین نسلوں کے استاد یہیں سے ریٹائر ہوئے۔ کالج میں زیر تعلیم بھانجے سے جاتے وقت یہ تو پوچھتے کہ محمد حسین کتنے پیسوں کی ضرورت ہے؟ یہ کبھی نہ پوچھا کہ پچھلے پیسے کہاں گئے؟ حالانکہ کوئی خاص فراخی تو نہ تھی۔ گونا گوں خوبیوں کے مالک ماموں بھانجے کا ساجھہ آج تلک قائم ہے۔

دوسری شخصیت موصوف کی والدہ سردار بی بی جن کا نام ذہن میں آتے ہی آج بھی میری آنکھیں فرط عقیدت و محبت سے نم ہو جاتی ہیں۔ انتہائی خلیق و شفیق، مونس و غمگسار، ایثار پیشہ، گہری چھاؤں۔ تنگدستی میں بھی کشادہ دل۔۔۔ کتنی برکت تھی ان کے وجود میں۔ کچی مٹی کا دو کمروں کا گھر، تنگ صحن، اپنے باسیوں کے لیے کشادہ و فراخ، امن و سکون کا گہوارہ۔ ہر وقت اڑوس پڑوس کی عورتوں کا جمگھٹا، اکثر دور و نزدیک کا کوئی نہ کوئی مہمان۔ میرا تقریبا سارا وقت یہیں گزرتا، فقط روٹی کھانے گھر جاتا لیکن خالہ بھی میرے لیے کچھ نہ کچھ سنبھال رکھتیں۔ میٹرک کر کے پرائمری مدرس بنا تو اسی مکتب کی روایات کا حتی المقدور پاس رکھا اور یہ اسی پاس رکھنے کا فیضان ہے کہ مجھ 75 سالہ کم عمر کو کوئی جسمانی یا روحانی روگ نہیں، خوش اور خوشحال ہوں۔

محمد حسین، ایسی عظیم شخصیتوں کے ہاں ولادت با سعادت اور تربیت پانے والا یتیم بچہ اتنا اعلیٰ ارفع نہ ہوتا جتنا کہ وہ تھا تو کیا ہوتا؟

سو یہ تھا اس بطل جلیل کی عزت و عظمت کا پس منظر۔ اس پس منظر کو سمجھے بغیر موصوف کی نہ موت کو سمجھا جا سکتا ہے نہ حیات کو۔

وہ میرا دوست بھی تھا اور میرا اس کے ساتھ یارانہ بھی تھا۔ میرا معالج بھی تھا اور میرا محسن بھی کہ میں نے اسی کے طفیل فہم دین حاصل کیا، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو پڑھا، امام حسن البناؒ کو پڑھا، سید قطب شہیدؒ اور شورش کاشمیری کا مطالعہ کیا۔

تب اقبال کا یہ شعر سمجھ آیا کہ ؎

چوں می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

سید صلاح الدین کو بھی پڑھا اور جب یہ پڑھا کہ ان کے سینے میں اتنی گولیاں لگی ہیں تو نہ معلوم کہاں سے میری زباں سے یہ الفاظ نکل پڑے ؎

اللہ کی الٰہیت والے تو سبھی سوئے دار گئے
ہم تو کلمہ پڑھتے رہے حلاوتِ زباں کے لیے

محمد حسین جب بھی لاہور سے اپنے گاؤں آتا تو زیادہ تر میرے ساتھ رہتا۔ میں اسے اکثر چھیڑتا کہ تو نے آبائی مذہب ترک کر دیا ہے۔ معنی خیز مسکراہٹ مسکراتا اور چپ ہو جاتا۔ اس معنی خیز مسکراہٹ کا راز اس کی وفات پر تعزیت کے لیے آنے والے ان حضرات سے کھلا جو ان سے فیضیاب ہوئے تھے۔

قیام لاہور میں اپنے محسن ماموں کے بیٹوں کو بغرض تعلیم اپنے پاس رکھا اور پھر ان کے بچوں کی بھی دستگیری کی۔

گذشتہ دس سال سے لاہور سے جوہر آباد منتقل ہو گئے تھے اور یہاں ایک تعلیمی ادارہ کا اجرا کر رکھا تھا جس کا انتظام و انصرام اکلوتے بیٹے پی ایچ ڈی سکالر عبدالحسیب کے ذمہ تھا۔ اس نے والد صاحب کے ساتھ رہنے کے لیے کسی قسم کی ملازمت سے اجتناب کیا۔ عجیب خمیر کے سیر چشم لوگ ہیں۔

اپنی آبائی زرعی زمین کا انتظام و انصرام اپنے سرپرست ماموں کو دیا جو بدستور آج بھی انہی کے پاس ہے۔ میرے استاد محترم نے ایک دو مواقع پر سالانہ آمدن وخرچ کی رپورٹ پڑھنا چاہی تو موصوف خراٹے بھرنے لگے۔

میں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اس پس منظر کو جانے بغیر موصوف کی موت وحیات کونہیں سمجھا جا سکتا۔ پروفیسر صاحب اکتوبر کے پہلے عشرے کے اختتام پر ماموں امیر حسین کے علاج معالجہ کے لیے لاہور گئے کہ محترم ان دنوں شیخ زید ہسپتال میں تھے، اچھے خاصے صحت مند تھے جب ماموں کی عیادت کو گئے۔ مگر وہ کوہ گراں شکست وریخت کی زد میں تھا جس کا کسی کو ادراک نہ تھا، ماموں تو صحت یاب ہو کر گھر واپس آ گئے مگر موصوف ۸/اکتوبر (۲۰۲۱ء) کی دوپہر فالج اٹیک کا شکار ہو گئے، اعصاب بری طرح مسمار ہوئے، بائیں طرف کا فالج جس نے لپیٹ میں لے لیا اور معدہ وامعاء کو اپنی گرفت میں۔

۱۰/اکتوبر اتوار تقریباً ۱۱ بجے لاہور حمید لطیف ہسپتال کی ساتویں منزل کے کمرہ نمبر ۴ میں بیڈ پر دراز تھے، مجھے دیکھتے ہی آنکھیں نم ہو گئیں۔ شاید زندگی میں زمانے نے انہیں روتے کبھی نہ دیکھا تھا، مجھے بستر پر سامنے بٹھایا۔ موجود افراد نے مجھے ان سے باتوں کا کہا۔ مَیں نے ان سب کو باہر نکل جانے کا کہا کہ تنہائی مطلوب تھی۔ پھر ان سے باتیں کیں جو کرنا تھیں، پھر سے دونوں روئے اور اتنا روئے کہ دریا بہا دیئے۔

میں فاضلِ طب بھی ہوں۔ اسی دن جان گیا تھا کہ فالج، ڈینگی اور ساتھ معدہ وامعاء کی اعصابی حرکت مفلوج ہے۔ میرا بھائی، میرا دوست جا رہا ہے۔

آج 16 نومبر ہے۔ دوپہر کا وقت ہے، یہ تحریر لکھتے ہوئے مَیں اب بھی رو رہا ہوں، میری آنکھیں دھندلا گئی ہیں، میری دنیا تو اندھیر ہو چکی ہے اور یہ موصوف یتیم پروری کرتے کرتے ۲۹/اکتوبر ۲۰۲۱ء کی شام 8:30 بجے اس جہان فانی سے آسودگی کی طرف چلے گئے۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعونَ.

یادرفتگان

ملک محمد صفدر امیر [1]

پروفیسر ملک محمد حسینؒ - چند یادیں

چند باتیں پروفیسر ملک محمد حسین مرحوم کے بارے میں لکھنے کی ہمت کر رہا ہوں تو میرے پاس وہ الفاظ نہیں جو اتنی بڑی عظیم شخصیت کے بارے میں کچھ لکھ سکوں۔ پروفیسر صاحب مرحوم میرے ماموں ہیں۔ مجھے وہ گاؤں سے لاہور اپنے گھر لے کر آئے۔ میں نے اپنی تعلیم ان کے پاس مکمل کی۔ ۱۹۸۵ء میں لاہور آیا۔ ہمیشہ انہوں نے مجھے بیٹے سے بھی زیادہ پیار دیا۔ ہر معاملے میں میری بہترین رہنمائی کی۔ آج بھی مَیں ان کے زیر سایہ رہتا تھا۔ ان کے دنیا سے رحلت کر جانے سے مَیں اپنے باپ کی شفقت سے محروم ہو گیا ہوں۔ ایسے لگتا ہے کہ جیسے آج مَیں یتیم ہو گیا ہوں حالانکہ میرے حقیقی والد تو ۲۰۰۰ء میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ ان کی محبت اور پیار میں باپ کی کمی کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ ان کی بڑی بیٹی میری بیوی ہے۔ لوگ کہتے وہ آپ کے سسر ہیں لیکن میں نے ہمیشہ لوگوں کو بتایا کہ میں ان کا بیٹا ہوں۔ میں نے شادی کے بعد علیحدہ ہونے کی کوشش کی لیکن ان کے پیار اور محبت میں جدا نہیں ہو پایا۔

پروفیسر صاحب مرحوم اپنے خاندان کے لیے ایک چھتر سایہ تھے۔ خاندان میں کوئی مسئلہ ہوتو انہوں نے حل کرنا۔ کوئی ضرورت ہوتو ہمیشہ وہ چپکے سے پوری کرتے۔ ان کی اپنی زمین سے جو فصل آتی وہ ہمیشہ رشتے داروں میں تقسیم کر دیتے کبھی خود اس سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ کوئی غریب رشتہ دار ہوتا تو چپکے سے اس کی مدد کر دیتے۔ انہوں نے دین کی سربلندی اور اسلامی انقلاب کے لیے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان کے اساتذہ کو اگر صحیح کر دیں اور پاکستان کے نصاب کو صحیح کر دیں تو اسلامی انقلاب آ جائے گا۔ اسی وجہ سے زندگی کا اکثر حصہ وہ تنظیم اساتذہ پاکستان کے ساتھ کام کرتے رہے۔ ان کا اسلامی نصاب اور یکساں نصاب میں نظام تعلیم پر کیا ہوا کام پاکستان کے وجود کے ساتھ قائم رہے گا، ان شاء اللہ۔ اساتذہ کی اسلامی تربیت کا پروگرام جہاں بھی ہوتا وہ ضرور وہاں اساتذہ کی تربیت کرنے جاتے۔ میں نے ہمیشہ

---

[1] ملک صاحب مرحوم کے داماد اور بھانجے (پنجاب یونیورسٹی، لاہور)

انہیں پاکستان میں سفر کرتے دیکھا۔ اسلامی تعلیم وتربیت کے لئے سفر کرتے ہوئے ہر پلیٹ فارم پر آپ نے آواز اٹھائی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر نوجوانوں کی صحیح تربیت کر دی جائے تو اس ملک میں اسلامی نظام زندگی کی بنیاد پڑ جائے گی۔ وہ جماعت اسلامی کے رکن رہے اور اس کے علاوہ بھی جہاں انہیں کوئی ایسا پلیٹ فارم ملا انہوں نے ہمیشہ اللہ کی رضا وخوشنودی کے لئے وہاں کام کیا۔ مزید یہ کہ اللہ تعالی نے انہیں لکھنے کا ملکہ دیا تھا۔ انہوں نے اسلامی نصاب اور یکساں نصاب پر بہت کام کیا اور اداروں کی رہنمائی کی۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی کاوشوں اور عمر بھر کی محنت کو قبول فرمائے اور ان کو اخروی زندگی میں کامیاب وکامران فرمائے، آمین۔

بقیہ: ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

ان دو باتوں میں وہ مجھ پر اسی طرح سخت تنقید کرتے تھے جس طرح وہ دوسروں پر کرتے تھے اور مَیں بلبلا اٹھتا تھا لیکن دو وجوہ کی بناء پر مَیں انہیں برداشت کرتا تھا۔ ایک تو مَیں سمجھتا تھا کہ جس آدمی نے دین صرف مولانا مودودیؒ سے سیکھا ہو، اس کے لیے واقعی میرے استدلال کو سمجھنا مشکل ہے۔ دوسرے مَیں سمجھتا تھا کہ وہ مخلص اور سمجھ دار ہیں اور جلد یا بدیر میرے استدلال کو ہضم کرنا شروع کر دیں گے چنانچہ انہوں نے مجھے برداشت کرنا شروع کر دیا تھا اور میرے نقطۂ نظر کے ریشنال کو سمجھنے لگے تھے۔

* خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔ بحیثیت انسان ہم میں سے کون ہے جس میں کمزوریاں اور خامیاں نہ ہوں۔ بایں ہمہ پروفیسر ملک محمد حسین جن کے ساتھ میں نے تیس پینتیس سال مل کر کام کیا مَیں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اسلام کے سچے خادم تھے، مخلص تھے اور محنتی تھے۔ تعلیم کے اسلامی تناظر میں جتنی پروفیشنل اور فنی خوبیوں کے وہ مالک تھے، اتنا شاید ہی ملک میں کوئی اور ہو۔ لیکن افسوس کہ ملک نے اور جماعت نے ان کی صلاحیتوں سے فائدہ نہ اٹھایا اور مَیں خواہش وکوشش کے باوجود اٹھا نہ سکا۔ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

یادرفتگان

ڈاکٹر محمد امین

پروفیسر ملک محمد حسین مرحوم

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

* اب تعین کے ساتھ کچھ یاد نہیں کہ پروفیسر صاحب کے ساتھ پہلی ملاقات کب ہوئی تھی۔ ۱۹۷۵ء میں بیرون ملک جانے سے پہلے میں چونکہ شعبۂ تعلیم سے وابستہ نہ تھا اس لیے 'تنظیم اساتذہ پاکستان' سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ تاہم پاکستان واپسی پر مرکز تنظیم میں آنا جانا رہا۔ پھر جب ڈاکٹر غلام مرتضیٰ ملک مرحوم نے پاکستان ماڈل ایجوکیشن انسٹی ٹیوشنز فاؤنڈیشن کے ایگزیکٹو سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا تو اسلامی تناظر میں نصاب سازی کا شعبہ میرے سپرد کیا۔ ہم نے پہلی سے بارہویں جماعت تک اسلامی تناظر میں نیا نصاب وضع کرنے کا فیصلہ کیا اور اس میں 'تنظیم اساتذہ پاکستان' سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ اس موقع پر نصاب کو پروفیشنل انداز میں فنی بنیادوں پر مرتب کرنے میں پروفیسر صاحب نے میری مدد کی۔ اس پراجیکٹ پر ہم نے تقریباً تین سال اکٹھے کام کیا۔ پھر جب اس نصاب کے مطابق نصابی کتب مرتب کر کے انہیں شائع کرنے کی باری آئی تو بدقسمتی سے ڈاکٹر غلام مرتضیٰ ملک اور انتظامی بورڈ میں اختلافات پیدا ہو گئے (کروڑوں کا معاملہ تھا) نصابی پراجیکٹ معطل ہو کر رہ گیا اور میں اسے چھوڑ کر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد چلا گیا۔

پروفیسر ملک صاحب نے اسلامی نصاب سازی کی اہمیت کے پیش نظر متبادل منصوبہ تیار کیا۔ قبل از وقت پنشن لے کر گورنمنٹ ملازمت سے فراغت حاصل کی۔ جماعت اسلامی کی تعلیم سے متعلق تنظیموں سے فنڈز اکٹھے کر کے 'آفاق' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ نئی نصابی کتابیں مرتب کیں اور کرائیں۔ ادارے کو مالی لحاظ سے مستحکم کیا اور تربیت اساتذہ کے لیے کئی اکیڈمیاں قائم کیں۔ اس پراجیکٹ میں انہوں نے اس نصابی کام کو بنیاد بنایا جو میں نے اور انہوں نے مل کر ملک غلام مرتضیٰ کے ہاں بنایا تھا۔ یہ سلسلہ چل پڑا لیکن بدقسمتی سے ۹/۱۱ ہو گیا اور جماعت میں ماڈرنسٹ اپروچ رکھنے والے بعض قائدین نے محسوس کیا کہ پروفیسر ملک صاحب کی مرتب کردہ

کتابیں فنڈامینٹلسٹ اسلوب کی حامل ہیں۔ چنانچہ ملک صاحب سے کہا گیا کہ وہ ہاتھ نرم رکھیں اور کتابوں پر نظر ثانی کر کے انہیں 'معتدل' بنائیں۔ ملک صاحب اس مداہنت پر تیار نہ ہوئے تو انہیں 'آفاق' سے نکال باہر کیا گیا اور نئی انتظامیہ نے کتابوں میں سے 'گاڑھا اسلام' نکال باہر کیا اور آج کیفیت یہ ہے کہ اس دودھ میں اتنا پانی ملا دیا گیا ہے کہ اس میں پانی ہی پانی ہے، دودھ برائے نام ہے۔ ملک صاحب نے اس کے بعد ذاتی طور پر بھی اس منصوبے کو چلانے کی کوشش کی لیکن یہ پراجیکٹ اتنا بڑا ہے کہ وافر مادی اور افرادی قوت کے بغیر اسے سنبھالنا مشکل ہے۔ پھر وہ تحریک اصلاحِ تعلیم میں میرے ساتھ شامل ہو گئے لیکن ہم خواہش و کوشش کے باوجود اتنے مادی وسائل اکٹھے نہ کر سکے کہ اس پراجیکٹ میں ہاتھ ڈالتے۔

* پروفیسر ملک صاحب نوجوانی ہی میں مولانا مودودیؒ کی تحریروں کے اسیر ہو گئے تھے۔ وہ سکول سطح پر پڑھاتے رہے۔ میرٹ سکالرشپ پر انہوں نے ماسٹرز امریکی یونیورسٹی بیروت سے کیا، پھر برطانیہ اور آسٹریلیا میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ وہ فنی طور پر سائنس کے ماہر مضمون تھے لیکن تربیت اساتذہ کا شعبہ ہمیشہ ان کی ترجیح رہا۔ وہ پنجاب یونیورسٹی کے ادارہ تعلیمی تحقیق (IER) میں بھی استاد رہے۔ ان کی عمر کا بڑا حصہ حکومت پنجاب کے تربیت اساتذہ کے ادارے میں گزرا جس کا نام پہلے DSD یعنی Directorate of Staff Development تھا اور آج کل اسے QAED یعنی Qaid-e-Azam Academy of Educational Development کہا جاتا ہے۔ ملک صاحب یہاں سے بطور ایڈیشنل ڈائریکٹر ریٹائر ہوئے۔

* ملک صاحب 'تنظیم اساتذہ پاکستان' کے سکولوں کی چین (Chain) کے جو'حرا سکولز' کے نام سے معنون ہے، تین سال تک ڈائریکٹر جنرل بھی رہے اور اس دوران انہوں نے ان سکولوں کے معیار کو اسلامی اور تعلیمی لحاظ سے بہتر بنانے کی بھرپور جدوجہد کی۔ وہ عمر بھر ''تنظیم اساتذہ پاکستان'' کے اس شعبے کے سربراہ رہے جس کا تعلق مرکز میں پالیسی سازی اور نصاب سازی سے ہے۔ پاکستان کی جتنی قومی تعلیمی پالیسیاں بنی ہیں اور ان میں جتنا اسلامی رنگ موجود ہے، اس میں ملک صاحب کی خاموش جدوجہد کا بڑا حصہ ہے۔ وہ تنظیم کے ماہانہ مجلّے 'افکار معلم' کے ایڈیٹر بھی رہے اور ان کے دوران ادارت اعلیٰ پائے کے مضامین اس میں شائع ہوتے رہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد وہ تنظیم کے دستور کے مطابق اس کے عہدیدار نہ رہے اور میاں مقصود صاحب جب امیر جماعت اسلامی پنجاب تھے تو انہوں نے محبت سے انہیں کھینچ کھانچ کر رکن جماعت بھی بنالیا۔

* میں نے اگست ۲۰۱۰ء میں جب البرہان جاری کیا تو انہیں اس میں لکھنے کی آزادی دی اور انہوں نے تعلیمی وتحریکی موضوعات پر خوب لکھا۔ اس دوران مَیں نے انہیں البرہان کا نائب مدیر بھی بنادیا اور ان سے ادارتی امور میں مشاورت بھی کرنے لگا۔ مَیں نے کئی دفعہ انہیں توجہ دلائی کہ وہ اپنے مضامین کا مجموعہ کتابی صورت میں مرتب کریں لیکن انہوں نے اس طرف توجہ نہ دی۔ یہاں تک کہ میں نے البرہان میں ان کے چھپے ہوئے مضامین کے پرنٹ نکلوا کر بھی انہیں دیے کہ وہ انہیں موضوع وار مرتب کرلیں لیکن انہوں نے اسے پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچایا۔ اب مَیں ان شاءاللہ خود ان کے مضامین کو ایڈٹ کر کے کتابی صورت دوں گا۔

ایک ماڈل اسلامی یونیورسٹی کے قیام کے لیے ملک صاحب اور مَیں عرصہ دراز سے کوششیں کررہے تھے۔ دو دفعہ کراچی فیڈریشن آف چیمبرز بھی گئے۔ لاہور چیمبر میں بھی ملٹی میڈیا پریزنٹیشن دی، ملک کے طول وعرض میں بیسیوں لوگوں سے ملے لیکن ہمیں اس میں کامیابی نہ ملی۔ پچھلے سال ہم نے شفقت محمود کے نام نہاد ''یکساں قومی نصاب'' کے خلاف زوردار مہم چلائی۔ ملک صاحب نے اس کے خلاف خوب لکھا اور ایک پوری کتاب اس پر تیار ہوگئی۔ پچھلے کچھ ماہ سے وہ 'رجال کار' اور اسلامی ذہن کے ٹھوس سکالرز کی تیاری کے ایک منصوبے پر کام کررہے تھے۔ اس غرض سے اسلام آباد بھی گئے اور کئی لوگوں سے نشستیں کیں۔

تحریک اصلاحِ تعلیم کا ایک پراجیکٹ سکولوں میں ترجمۂ قرآن کی ترویج کا بھی ہے۔ مَیں نے اس کے لیے 'تدریس القرآن' کے نام سے ایک خصوصی پیکج تیار کیا اور ملک صاحب کی تجاویز کے مطابق اس میں ردّوبدل کیا بلکہ 'تدریس القرآن' کا نام بھی انہی کا تجویز کردہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لیے فنڈز مہیا کرنے کا انتظام فرمادیا اور ہم آج کل لاہور کے سکولوں میں اس کی ترویج کے لیے مہم چلائے ہوئے ہیں۔ ملک صاحب اس میں بھی بہت دلچسپی لے رہے تھے اور ڈیڑھ ماہ پیشتر ایک سنیئر سرکاری افسر کے پاس ہم اس سلسلے میں گئے جنہوں نے DSD میں ملک

صاحب سے تربیت حاصل کی تھی۔

* آج اگر میں سوچوں کہ میری اور ملک صاحب کی دوستی اور مزاجی ہم آہنگی کا راز کیا تھا؟ تو دو باتوں کی طرف دھیان جاتا ہے۔ ایک یہ کہ میری طرح وہ بھی تعلیم وتربیت کو بنیادی اہمیت دیتے تھے۔ ہم دونوں یہ سمجھتے تھے کہ جب تک تعلیمی اداروں کو دعوت واصلاح کی بنیاد نہ بنایا جائے، انہیں تعمیر سیرت اور تعمیر کردار کا مرکز نہ بنایا جائے، اس وقت تک معاشرے اور ریاست میں کسی اسلامی تبدیلی کا سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ اسی طرح ہم اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں تحقیق کو بھی اسی رنگ میں رنگنا چاہتے تھے تاکہ ایسے افراد کار تیار کیے جاسکیں جو اسلام کو اعلیٰ علمی وفکری بنیادوں پر دنیا کے سامنے پیش کرسکیں۔

میرا اور ان کا دوسرا ذہنی اشتراک یہ تھا کہ ہم دونوں تنقیدی اسلوب اور ذہنیت رکھتے تھے۔ مَیں چونکہ تحریر کا آدمی ہوں اور چھپنے سے پہلے لکھے ہوئے پر نظر ثانی کرنے کا کافی موقع مل جاتا ہے لہٰذا میں کوشش کرتا ہوں کہ میری تنقید شستہ اور سنجیدہ ہو لیکن ملک صاحب اپنی تحریر وتقریر میں کسی مداہنت اور نرمی کے قائل نہ تھے۔ ان کے احباب جانتے تھے کہ وہ تنقید کے قدرے تیز ہیں لیکن دل کے بہت اچھے ہیں۔ پھر وہ کسی پر ناجائز تنقید یا ذاتی حملے نہ کرتے تھے۔ جماعتی قیادت ہو، تنظیم کی قیادت ہو، سکولوں کے سربراہان ہوں یا کوئی دوسرا ذمہ دار، جو لوگ کام نہ کریں، یا دیانت داری سے نہ کریں یا مادی اور ذاتی مفاد کو اسلامی اور تحریکی مفاد پر ترجیح دیں، ان پر ملک صاحب بے باک تنقید کرتے تھے۔

* میرا اور ان کا دو باتوں میں اختلاف بھی تھا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ جماعت اسلامی میں آج جتنی خرابیاں ہیں وہ اس وجہ سے ہیں کہ وہ مولانا مودودیؒ کی راہ سے ہٹ گئی ہے جبکہ میری رائے یہ ہے کہ جماعت آج جہاں آ پہنچی ہے وہ مولانا ہی کی فکر کا منطقی نتیجہ ہے اور اصل خرابی فکر میں ہے۔ اسی طرح مَیں یہ کہتا تھا کہ جماعت اور پاکستان کی دوسری دینی قوتوں کے ناقص تصور دین اور غیر موزوں حکمت عملی نے پاکستانی فرد، معاشرے اور ریاست کو جس اخلاقی اور دینی بحران میں مبتلا کردیا ہے، اس کا حل یہ ہے کہ ایک نئی اصلاحی تحریک اٹھے لیکن وہ جماعت اسلامی سے باہر کچھ سوچنے پر تیار ہی نہ تھے۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۲۸)

یادرفتگان پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی[۱]

پروفیسر ملک محمد حسین مرحوم-ایک معلم،ایک قلم کار

راقم ستر کی دہائی میں گورنمنٹ کالج سرگودھا میں لیکچرر تھا۔ غالباً ۱۹۷۴ء میں شعبۂ تعلیم میں ایک نئے استاد تشریف لائے۔ نام تھا ملک محمد حسین (۲ جون ۱۹۴۲ء-۲۹ اکتوبر ۲۰۲۱ء)۔ چند ہی دنوں میں اندازہ ہو گیا کہ بہت قابل اور متحرک شخصیت ہیں۔ وہ کالج کے ایک سینئر اُستاد اور ریاضی کے پروفیسر چودھری عبدالحمید صاحب کے بہت قریب تھے۔ چودھری صاحب نے ملک صاحب کو بعض ذمہ داریاں سونپیں جنھیں وہ بڑی مستعدی سے انجام دینے لگے۔ بعض اوقات کسی کام کے لیے وہ اُنھیں لاہور، لائل پور یا سیالکوٹ بھی بھیجتے۔ بعض احباب اور رفقائے کار کی تجویز پر چودھری صاحب نے اُنہی دنوں پنجاب یونیورسٹی کی سینٹ کی رکنیت کے انتخاب میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ ملک محمد حسین صاحب الیکشن کی مہم میں بڑی استقامت کے ساتھ چودھری صاحب کے دست و بازو بنے رہے۔ اُس زمانے میں اُنھوں نے صوبے کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے کالج اساتذہ کے ووٹروں کو چودھری صاحب کے حق میں ہموار کرنے کے لیے شب و روز ایک کر دیے۔ چودھری عبدالحمید صاحب بھاری اکثریت سے رکن منتخب ہو گئے۔ اگلی میقات میں چودھری صاحب نے سنڈیکیٹ کا الیکشن لڑنے کا ارادہ کیا اور ملک صاحب نے اُسی طرح اُن کا ساتھ دیا چنانچہ وہ سنڈیکیٹ کے رکن منتخب ہو گئے۔ ملک صاحب نے اپنے ایک مضمون میں چودھری صاحب کی بے حد تعریف کی ہے۔ عبدالحمید صاحب اگست ۱۹۶۹ء میں ملک محمد حسین صاحب کو تنظیمِ اساتذۂ پاکستان میں لائے۔ اُنھوں نے تنظیم کے لیے بھی بڑی مستعدی سے کام کیا۔

۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۴ء تک وہ امیریکن یونی ورسٹی آف بیروت (AUB) میں زیرِ تعلیم رہے۔

راقم ۱۹۸۰ء میں لاہور آ گیا۔ اسّی کی دہائی میں ملک صاحب بھی لاہور آ گئے۔ کچھ عرصہ گورنمنٹ اسلامیہ کالج لاہور کینٹ میں پڑھایا۔ پھر پنجاب یونیورسٹی کے اُنسٹی ٹیوٹ آف

[۱] مشہور ماہر اقبالیات، مصنف اور دانشور (تمغۂ امتیاز)

ایجوکیشن اینڈ ریسرچ (I.E.R) سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۸۳ء میں یونیسکو ریسرچ فیلوشپ پر موناش یونیورسٹی (ملبورن، آسٹریلیا) چلے گئے اور وہاں ایک یا دو سال گزارے۔ واپسی پر چند کرم فرماؤں کی عنایات سے اُنھوں نے آئی ای آر کو چھوڑ دیا اور واپس کالج میں آ گئے۔ یہیں سے وہ ریٹائر ہوئے۔

ادارۂ آفاق کے لیے اُنھیں مختلف مضامین کی نصابی کتابیں مرتّب کرنے کا کام سونپا گیا جسے اُنھوں نے بڑی مستعدی کے ساتھ بہت کم وقت میں مکمل کر دیا۔ اُنھوں نے اُردو کی نصابی کتابیں مرتّب کرتے ہوئے راقم کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ کئی روز تک شب و روز اُن کے ساتھ کام کرتے ہوئے اُنھیں اور قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اُن کے اخلاص اور شگفتہ طبعی کا اندازہ ہوا۔

ایک بار چند دوستوں سے مل کر اُنھوں نے نصابی کتابیں تیار کرنے کا اپنا ادارہ قائم کیا۔ اس کے تحت کتابیں خود تیار کیں اور بعض دوستوں سے بھی تیار کرائیں۔ برادرم ڈاکٹر عبداللہ شاہ ہاشمی نے بتایا کہ اُنھوں نے مجھ سے بھی چوتھی جماعت سے آٹھویں جماعت تک کی اردو قواعد و انشا کی کتابیں تیار کروائیں۔ پھر اُن کی ترویج کے لیے مجھے اٹک (سابق کیمبل پور) بھیجا۔ میں اٹک اور ملحقہ علاقوں کے بہت سے اساتذہ سے ملا، اُنھیں کتابیں پیش کیں۔ ملک صاحب نے اپنے طور پر بھی، اساتذہ سے ذاتی تعلقات کے حوالے سے کتابیں پھیلائیں لیکن ادارہ چل نہیں سکا۔ دوستوں نے بھی ہاتھ کھینچ لیا اور ادارہ ختم کر دیا گیا۔

پھر وہ اپنے آبائی علاقے جوہر آباد، ضلع خوشاب چلے گئے اور وہاں جا کر اُنھوں نے ایک سکول قائم کیا جسے اُنھوں نے ڈگری کالج کے درجے تک پہنچایا اور اِسی میراث کو چھوڑ کر وہ ۲۹ اکتوبر ۲۰۲۱ء کو آخرت کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

ہمارے ہاں اکثر و بیشتر معلّمین کی معلّمی فقط کلاس روم میں لیکچر دینے تک محدود رہتی ہے۔ ملک صاحب ایک معلّم ہونے کے ساتھ ایک قلم کار بھی تھے۔ انھوں نے تعلیم (Education) کے موضوع پر بہت کچھ پڑھا، ڈگریاں بھی حاصل کیں، مگر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ لکھا بھی۔

غالباً کالج کے زمانے میں مضمون نگاری کا آغاز کیا اور رفتہ رفتہ تیز رو (go fast) ہوتے گئے۔ تنظیم اساتذہ پاکستان کے رسالے 'افکارِ معلّم' میں مضمون نویسی رسالے کے اجرا کے ساتھ ہی شروع کردی۔ ہر دو چار ماہ کے بعد تعلیم سے متعلق کسی نہ کسی موضوع پر قلم اُٹھاتے اور بڑے رواں دواں اسلوب میں مضمون لکھ ڈالتے۔ افکارِ معلّم کے مختلف شماروں میں ان کے چند مضامین کے عنوانات دیکھیے:

۱۔ معلّم اور عملِ ابلاغ۔ جون ۱۹۸۹ء

۲۔ پاکستان میں پرائمری تعلیم: ایک تجزیہ۔ مئی ۱۹۹۰ء

۳۔ تنظیمِ اساتذہ پاکستان کی تاریخی جدوجہد اور بہبودِ اساتذہ۔ جون ۱۹۹۰ء

۴۔ تنظیمِ اساتذہ پاکستان: ایک نظریہ، ایک تحریک۔ ستمبر ۱۹۹۰ء

۵۔ اسلامی جمہوری اتحاد کے منشور کی روشنی میں تعلیم کا مجوزہ ایکشن پلان۔ دسمبر ۱۹۹۰ء

۶۔ تنظیم اساتذہ ہی کیوں؟۔ مارچ ۱۹۹۱ء

۷۔ امتحان کے تقدس اور افادیت کی بحالی۔ جولائی ۱۹۹۱ء

۸۔ مجوزہ قومی تعلیمی پالیسی کا معروضی جائزہ۔ اگست ۱۹۹۱ء

۹۔ نصابِ تعلیم وتربیت برائے ابتدائی مدارج۔ اکتوبر ۱۹۹۱ء

۱۰۔ نظامِ تعلیم کی اسلامی تشکیل۔ دسمبر ۱۹۹۱ء

۱۱۔ اعلیٰ معیارِ تعلیم۔ دسمبر ۱۹۹۱ء

۱۲۔ پنجاب میں لازمی تعلیم کا نفاذ: مضمرات اور تجاویز۔ مارچ ۱۹۹۵ء

۱۳۔ سیّد مودودی کے تعلیمی نظریات۔ جنوری ۱۹۹۶ء

۱۴۔ فروغِ تعلیم کے دلچسپ منصوبے۔ فروری ۱۹۹۶ء

۱۵۔ آشوبِ تعلیم۔ مئی ۱۹۹۶ء

۱۶۔ پرائمری اساتذہ کا ملازمتی ڈھانچا: چند تجاویز۔ اگست ۱۹۹۶ء

۱۷۔ تعلیمی ترقی۔۔مگر کیسے؟۔ستمبر ۱۹۹۶ء

ملک صاحب کے یہ چند مضامین "مُشتے نمونہ از خروارے" کی حیثیت رکھتے ہیں۔آپ ۲۰۱۰ء تک کے افکارِ معلّم کے شمارے دیکھیں تو تقریباً ہر شمارے میں یا ایک دو مہینوں کے وقفے سے ملک صاحب کے مضامین ملیں گے۔

تقریباً دس برس قبل ڈاکٹر محمد امین صاحب نے ایک رسالہ ماہ نامہ البرہان جاری کیا اور ملک محمد حسین صاحب کو نائب مدیر مقرر کیا۔ملک صاحب البرہان میں لکھنے لگے۔وہ ہر ماہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ یوں اُنھوں نے بیسیوں مضامین لکھے۔تعلیم اور شعبۂ تعلیم سے ہماری حکومتوں نے جس طرح سوتیلے پن کا مظاہرہ کیا ہے، ملک صاحب نے اُسے تنقید کا نشانہ بنایا۔ تنظیمِ اساتذۂ پاکستان نے تعلیم کی اصلاحِ احوال کے لیے جو منظّم جدوجہد کی، ملک صاحب اس میں شامل رہے ہیں۔اُنھوں نے تعلیم میں تنظیم کی عطا (Contribution) کو نمایاں اور واضح کیا۔۱۹۹۱ء میں لکھا:

"تنظیمِ اساتذہ پاکستان کے ۲۱ سالوں کو دو ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔حسنِ اتفاق سے یہ دونوں دور دس دس سالوں پر مشتمل ہیں۔

پہلا دور: ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۸ء تک۔اسے تشکیلی دور کہا جاسکتا ہے۔

دوسرا دور: ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۸ء تک۔اسے تعمیری دور کہا جاسکتا ہے۔

اور تیسرا دور جو ۱۹۸۹ء سے آغاز پذیر ہوا انشاءاللہ 'توسیعی دور' ہوگا۔

دورِ اول میں تنظیمِ اساتذہ پاکستان کئی ایک نشیب وفراز کا شکار رہی۔" (افکارِ معلم لاہور۔ جنوری ۱۹۹۱ء۔ص ۴۸)۔پھر وہ کہتے ہیں:

"اس دور کے پکارنے والی عظیم ہستیوں کا ذکر نہ کرنا تنظیم اساتذہ کی تاریخ سے ناانصافی ہوگا۔ڈاکٹر محمد اسلم قریشی مرحوم تنظیم کے ان عظیم محسنوں میں سے ہیں جنھوں نے اوّلین قیادت مہیا کی۔ان کی بے لوث کاوش اور سنجیدہ قیادت نے تنظیم اساتذہ کے ابتدائی تشکیلی دور میں اہم کردار ادا کیا۔ پروفیسر سیّد محمد سلیم جو آج ریٹائر ہوکر بھی تنظیمِ اساتذہ کی روح ہیں، تنظیم کے اولیں محسنوں

میں سے ہیں۔ تنظیم اساتذہ میں سیّد موصوف کا تنہا رول باقی تمام ارکان پر بھاری ہے۔ پروفیسر گوہر صدیقی کی خاموش قیادت اور ولولہ انگیز خطابات نے تنظیم کے تشکیلی اور تعمیری دور میں اہم کردار ادا کیا۔"(ایضاً)

ایک مضمون میں اُنھوں نے تنظیم کی بین الاقوامی کانفرنس کا ذکر اس طرح کیا ہے: "۱۹۷۸ء کی قومی تعلیمی کانفرنس تنظیمِ اساتذہ کے اولین دور کا عروج تھا۔ جامعہ پنجاب کا وسیع وعریض کیمپس اپنی تنگ دامانی کی شکایت کر رہا تھا۔ فیصل آڈیٹوریم کی ان گنت نشستیں نصف مندوبین کو بھی اپنے اندر نہ سما سکیں۔ غالباً ملک میں پہلی مرتبہ کسی کانفرنس میں مندوبین کو پروگرام میں شریک کرنے کے لیے کلوز سرکٹ ٹیلی ویژن کا استعمال کیا گیا۔ دیر اور چترال کے بلند وبالا پہاڑوں سے لے کر کراچی کی چکا چوند انسانی بستیوں تک اور کشمیر کے دلفریب دیہاتوں سے لے کر بلوچستان کے سنگلاخ ویرانوں تک ہر جگہ سے قوم کے معماران کے قافلے قطار اندر قطار جامعہ پنجاب میں اترے۔ قومی اور بین الاقوامی سطح کے منتخب ماہرین اور محققین نے اپنی شرکت سے کانفرنس کو چار چاند لگائے۔ قومی عمائدین اور حکومتی اشراف کانفرنس میں جلوہ افروز ہوئے اور روح پرور فضا کی سعادتیں لوٹیں۔ یہ کانفرنس پاکستان میں تعلیم کی قومی تاریخ میں ایک سنگِ میل ثابت ہوئی۔" (افکارِ معلم لاہور۔ جنوری ۱۹۹۱ء۔ ص ۵۰)

ایک اور مضمون میں ملک صاحب نے معلّم کے مقام و مرتبے اور کردار پر قلم اُٹھایا۔ کہتے ہیں: "اصطلاحی معنوں کے لحاظ سے معلّم کی ذمہ داری بڑی نازک اور قیامت کے روز جوابدہی کے احساس کی وجہ سے بڑی کٹھن ہے۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ معلّم کے لیے یہ فرض دوگونہ اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس فرض کی بجا آوری کے لیے قوم معلّم کی تنخواہ کی شکل میں اس کا اجر بھی ادا کرتی ہے۔ لہٰذا معلّم کی طرف سے اس فرض کی بجا آوری میں ذرا سی کوتاہی بھی اس کی دنیا و آخرت کو تاریک بنا سکتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ معلّم اپنے آپ کو ابلاغ کی بہترین صلاحیتوں سے مسلح کرے اور موثّر ابلاغ کے راستے میں حائل تمام ذاتی، معاشرتی، فکری اور طبعی رکاوٹیں دور کرنے کی بھرپور سعی کرے۔ تبھی وہ اپنے ابنائے جنس کے سامنے اور خالقِ کائنات کے سامنے سرخرو ہو سکے گا۔" (افکارِ معلّم لاہور۔ جون ۱۹۸۹ء، ص ۲۲۔۲۳)

ملک صاحب نے اپنے اساتذہ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے نومبر ۲۰۰۶ء میں "میرے محبوب اساتذہ" کے عنوان سے ایک مضمون قلم بند کیا۔ اِس میں وہ کہتے ہیں:

"استاد اگر اپنے فرائضِ منصبی محنت اور خلوص سے ادا کرے تو اُس کے طلبہ پر اُس کی شخصیت کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔ میں خود اپنے کئی اساتذہ کی عظیم شخصیتوں کا نقش اپنے ذہن میں بسائے ہوئے ہوں اور اُن اساتذہ نے میری اپنی معلّمانہ زندگی کے لیے ایک روشن اور راہ نما مینار کا کام کیا ہے۔" (ایضاً، ص ۱۰۲)

اس زمانے میں اُنھوں نے اپنے بہت سے اساتذہ (چودھری محمد بشیر احمد۔ حافظ عبدالرحیم۔ پروفیسر قاری محمد صادق۔ پروفیسر نور محمد کمال۔ پروفیسر چودھری عبدالحمید۔ ملک محمد یوسف۔ محمد نواز بکھر۔ پروفیسر ملک عبدالغنی۔ پروفیسر عبدالعلی خان۔ مولانا عبدالقدوس ہاشمی۔ ڈاکٹر دین محمد ملک۔ ڈاکٹر افتخار این حسن۔ ڈاکٹر محمد الیاس۔ پروفیسر اے ایچ سیّد۔ پروفیسر ڈاکٹر میکلا ریس۔ ڈاکٹر وکٹر بلے۔ ڈاکٹر پیٹر فینشم۔ پروفیسر ڈاکٹر گن سٹن (Gunstone)) کی تعریف و تحسین کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر وکٹر بلے (Victor Billeh) میرے محبوب ترین اُستاد تھے۔ اُن سے میں نے دو کورس پڑھے۔ میرے مقالے (Thesis) کے ایڈوائزر بھی وہی تھے۔ اپنے شاگردوں کے ساتھ پیار کرنے والا، اُن کی ہر ممکن مدد کرنے والا اور رات دن کے اوقات کی قید کے بغیر، شاگردوں کی راہ نمائی کے لیے ہمہ وقت مستعد رہنے والا عظیم استاد۔ میں نے مطلوبہ کورس ورک وقت سے پہلے مکمل کر لیا تھا اور تھیسز بھی تقریباً مکمل تھا لیکن ابھی میرے سکالرشپ کے دو ماہ باقی تھے۔ میں نے کچھ go slow [آہستہ رو] کا رویہ اختیار کیا تو ڈاکٹر بلے نے ایک دن مجھے بلا کر کہا:

Mr. Malik, I feel you have become somewhat lazy and perhaps you want to delay your stay here at AUB. I will not allow you to do this. Complete your degree immediately and go back to serve your nation. You were not sent here to enjoy but to work hard and go back to serve your nation.

آخری اطلاعات تک ڈاکٹر وکٹر بلے اردن کی یرموک یونی ورسٹی میں پڑھا رہے تھے۔ یاد رہے ڈاکٹر بلے فلسطینی عیسائی تھے اور پاکستان سے محبت کرتے تھے۔"

"۱۹۸۳ء میں جب میں موناش یونیورسٹی ملبورن آسٹریلیا میں یونیسکو ریسرچ فیلوشپ کر رہا تھا تو وہاں فیکلٹی آف ایجوکیشن میں فیکلٹی کے ڈین ڈاکٹر پیٹر فینشم سے قریبی رابطہ رہا۔ پروفیسر ڈاکٹر گن سٹن (Gunstone) کا دفتر میرے دفتر کے ساتھ تھا۔ دونوں حضرات اپنے معلمانہ کردار اور مشفقانہ رویوں میں ہمارے ملک کے آج سے ستر اسی سال پہلے کے اساتذہ جیسے تھے۔ بے لوث، مخلص اور اپنے شاگردوں کی راہنمائی کے لیے ہمہ وقت تیار۔" (ایضاً ص ۱۰۵)

ملک صاحب نے یہاں اِس ناکارہ راقم الحروف کا بھی ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"یہ ایک طرح کی بے انصافی ہوگی اگر میں اُن رفیق اساتذہ کا تذکرہ نہ کروں جن کے ساتھ تنظیم اساتذہ میں مجھے کام کرنے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر رفیع الدّین ہاشمی اس بات کے سب سے زیادہ مستحق ہیں کہ ان کا ذکرِ خیر کیا جائے۔ ہاشمی صاحب گورنمنٹ کالج سرگودھا میں میرے رفیق کار تھے۔ بعد میں وہ لاہور آ گئے اور گورنمنٹ کالج سے ہوتے ہوئے پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج سے منسلک ہو کر ریٹائر ہوئے۔ ہاشمی صاحب کا زندگی بھر کا معمول رہا ہے کہ صبح سویرے اپنے ادارے میں آجاتے اور اوقاتِ کار کے آخر تک ادارے میں موجود رہتے۔ موصوف اپنے تدریسی پیریڈز کے بعد بھی اپنے دفتر میں طلبہ کے ساتھ مصروف رہتے۔ طلبہ کی راہنمائی، ان کو ذاتی لائبریری سے کتب دینے اور پھر کتب پر تبادلہ خیال ان کا معمول تھا جو اَب بھی قائم ہے۔ اِس طرح وہ بعض لائق اور اچھے طلبہ کو اپنے قریب کرنے میں کامیاب رہتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی اُن کا یہ معمول قائم ہے۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طلبہ اُن کی رہائش گاہ واقع منصورہ میں پھیرے لگاتے رہتے ہیں اور علم کے اس سمندر سے اپنی اپنی بساط کے مطابق پیاس بجھاتے رہتے ہیں۔" (ایضاً ص ۱۰۵-۱۰۶)

اِسی مضمون کے آخر میں اُنھوں نے اپنے بعض شاگردوں اور رفقا (پروفیسر رانا اصغر علی، رانا عبدالحی مرحوم، پروفیسر عبدالحمید ڈار، ملک سجاد الرحمٰن طارق، ملک غلام شبیر، پروفیسر محمد امیر ملک، پروفیسر عبداللہ ذاکر، ڈاکٹر محمد اقبال ظفر، ڈاکٹر مشتاق الرحمٰن صدیقی، محمد انور رومان، حافظ وحید اللہ

خان، پروفیسر محمد حسین سومرو، محمد حسن بلیدی، اختر علی خان، ماسٹر بسم اللہ صاحب) کا توصیفی تذکرہ کرتے ہوئے مضمون کو یوں ختم کیا ہے:

"میں نے عصرِ حاضر کے اساتذہ کی آنکھیں چندھیا دینے والی کہکشاں سے صرف چند ستاروں کا ذکر کیا ہے۔ اس کہکشاں میں ہزاروں ستارے اور چاند ہیں جن کا ذکر کیا جائے تو ایک عظیم انسائیکلو پیڈیا آف ٹیچرز ترتیب پا جائے۔" (ایضاً ص ۱۰۸)

برادرم پروفیسر سلیم منصور خالد صاحب نے سطور بالا دیکھ کر توجہ دلائی کہ ایک نکتہ رہ گیا، اور وہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں جس قدر تعلیمی پالیسیاں آتی رہی ہیں، حکومت کی طرف سے، کریکولم ونگ کی طرف سے، وزرات تعلیم کی طرف سے یا ہائر ایجوکیشن کی طرف سے، ان پالیسیوں پر کسی بھی ادارے یا تنظیم یا شخصیت سے پہلے وہ ڈاکومنٹ حاصل کر کے، اس کا مطالعہ کر کے بہت گہرے طریقے سے اور بہت concise اور ٹو دی پوائنٹ hit کرتے تھے۔ خاص طور پر اسلامی، پاکستانی اور پروفیشنل بیس کو بنیاد بنا کر تجزیہ کرتے تھے اور ساتھ ہی اس کے تضادات کو بہت خوبی سے واضح کرتے تھے۔ یہ خوبی پورے پاکستان میں کسی اور میں نہیں تھی۔ اس اعتبار سے ان کی رحلت، تعلیم کے شعبے کے لیے بہت بڑا نقصان ہے۔ جو کام انھوں نے کیے، یہ ان کا بہت بڑا contribution ہے۔ اب آئندہ کون کرے گا؟ بہت سے پالیسی ساز ملک صاحب سے خائف بھی رہتے تھے۔ قومی سطح پر ملک صاحب کی خدمات کا اعتراف اگرچہ کچھ نہ کچھ ہوا، مگر خاطر خواہ طریقے سے نہیں ہو سکا۔

ایک اور پہلو یہ ہے کہ ملک صاحب نے پاکستان کے علما، ماہرین تعلیم اور پالیسی سازوں کو ایک دو نہیں، درجنوں مواقع پر بریف کیا اور متعین طور پر سائنٹیفک طریقے سے، دلیل سے، اور متن کے الفاظ کے استعمال کو بنیاد بنا کر، بے شمار لوگوں کو مختلف اداروں میں جا کر مثلاً جامعہ اشرفیہ، ملی مجلس شرعی اور پنجاب یونیورسٹی میں تعلیم کے تجزیہ کا بے پناہ کام کیا۔

یادرفتگان

ڈاکٹر ابصار احمد[1]

تعلیم کی اصلاح اور اسلامی تشکیل

پروفیسر ملک محمد حسینؒ کی اَن تھک اور نا قابل فراموش مساعی

دورِ حاضر میں تعلیم کی اصلاح اور ''اسلامیانے'' یا بالفاظ دیگر اسلامی تشکیل کے تصور کی تاریخ کم وبیش ایک صدی سے زیادہ طویل ہے۔ استعماری قوتوں نے جس طرح بلادِ اسلامیہ میں ہماری دینی وتہذیبی اقدار، تعلیمی نظام اور بنیادی عقائدی مسلمات کو تاراج کیا، اس کا نوٹس اسلامیانِ برصغیر کے دردمند اور صاحبانِ علم وفکر نے انتہائی گہری بصیرت اور موثر انداز میں لیا۔ ان میں اکبرالہ آبادیؒ، علامہ اقبالؒ، مولانا مودودیؒ کے علاوہ بہت سی ثقہ فاضل دینی شخصیات شامل رہی ہیں۔ امریکہ میں اس Islamization of knowledge کی تحریک کا آغاز اسماعیل راجی الفاروقی اور ان کے ساتھیوں نے گزشتہ صدی کے وسط میں المعهد العالمی للفکر الاسلامی (IIIT) ہرنڈن (ورجینیا) میں قائم کر کے کیا۔ اور بہت سے مغربی جامعات کے اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان فضلاء نے مختلف علوم (نیچرل اور سوشل سائنسز دونوں) میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں عصری مباحث میں دینی وایمانی اجزا کو علمی سطح پر نمایاں کیا۔ اس طرح اباحیت آشنا مادیت اور ملحدانہ اور جدیدیت گزیدہ افکار سے تطہیر کر کے مختلف ڈسپلنز کی اسلامی فریم ورک میں تشکیل نو کے کام کو آگے بڑھایا۔ IIIT کی کثیر تعداد میں موضوعاتی مطبوعات اور سہ ماہی علمی جریدہ American Journal of Islamic Social Sciences میں شائع شدہ فکرانگیز اور دانش نورانی وبرہانی سے لیس ریسرچ مقالات نے عالمی سطح پر یونیورسٹیوں میں اساتذہ اور طلبہ کے علمی مسائل کی اسلامی پیراڈائم اور فریم ورک میں تفہیم کے حوالے سے رہنمائی کی ہے۔ تاہم ہمیں اس context میں حضرت عمر بن الخطابؓ کے قول ''جو جاہلیت کو نہیں جانتا وہ اسلام کو بھی نہیں جانتا'' کے مطابق جاہلیت جدیدہ سے بھی کما حقہ واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت ہے جس کے متبعین نے وحی الٰہی اور سنت رسول (ﷺ) کا

[1] سابق سربراہ شعبۂ فلسفہ جامعہ پنجاب، لاہور (برادر خورد ڈاکٹر اسرار احمدؒ)

انکار اور مخالفت کر کے گمراہی سے ناطہ جوڑ رکھا ہے۔اس طرح خدا کو ماننے والے ذہن کے لیے دنیا اور زندگی کی جو فطری معنویت ہے، مغرب نے اسے غیر متعلق بنا دیا ہے۔مغربی فکر و تہذیبی اوضاع فی الجملہ اخلاقی اباحیت، مادیت، الحاد اور نفس پرستی کی شکلیں ہیں۔اکیڈیمیا میں مادیت کی جدید فکری فراوانی اور چمک دمک (حقیقت میں گھٹاٹوپ اندھیروں) نے آج کے انسان کے لیے روحانی طور پر جینا اور آخرت کی کامیابی وکامرانی کا حصول مشکل ہی نہیں ناممکن بنا دیا ہے، اور ''حق کیا ہے؟'' کے سوال کو غیر متعلق کر دیا ہے حالانکہ یہی سوال انسان کو حیوان سے ممیز کرتا ہے۔

وطن عزیز مملکت خداداد پاکستان میں تعلیم کا نظام اور نصابات آغاز سے اب تک وہی چل رہے ہیں جن کو وضع کرنے والے سیکولر اور جدیدیت میں لتھڑے ہوئے ریاستی کارپردازان تھے۔ان میں سابقہ استعماری اور نو آبادیاتی غیر مسلم غاصب حکمرانوں کی بنائی ہوئی پالیسیوں، طریق تعلیم، ہمارے معتقدات اور دینی وتہذیبی تعلیم کو مسخ کرنے کا عمل جوں کا توں جاری ہے۔اسلامی روایتی تناظر میں تعلیم وتدریس کے ساتھ کردارسازی اور اخلاقی تربیت کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے جسے ہماری تعلیم گاہوں اور جامعات میں بالکل نظرانداز کیا گیا۔اکیڈیمیا اور میڈیا ایسے خواتین وحضرات سے بھرا پڑا ہے جو خود مغربی سیکولر تعلیم کے پروردہ ہیں۔چنانچہ یہ بالخصوص شہری آبادی کے نوجوان طلبہ و طالبات میں ازحد ایمان سوز اور اخلاق باختگی کے رویوں کو پروموٹ کرتے ہیں۔

میری دانست میں اصلاحِ تعلیم اور اس کی اسلامی تشکیل کے لیے پاکستان میں اسلامی جذبہ رحمیت رکھنے والے صاحبانِ علم وفضل میں سرفہرست دو حضرات ہیں: ایک مدیر ''البرہان'' ڈاکٹر محمد امین اور دوسرے ان کے نظریاتی ساتھی اور دست راست پروفیسر ملک محمد حسین صاحبؒ، جو 29 اکتوبر کو مختصر علالت کے بعد ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون! بقول ڈاکٹر امین صاحب، پروفیسر مرحوم اصلاح تعلیم مہم میں ان کے گزشتہ تیس سال سے رفیق کار تھے۔پروفیسر ملک محمد حسین راقم سے عمر میں کم وبیش تین سال بڑے تھے۔ہم دونوں پنجاب یونیورسٹی میں فیکلٹی ممبر ہونے کی وجہ سے 1973ء سے شناسا تھے۔ملک صاحب انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ (IER) میں سینئر استاد اور راقم شعبہ فلسفہ میں معلم تھا۔چونکہ میں نے

ملازمت ڈاکٹریٹ کے بعد شروع کی تھی اس لیے جلد ہی اسسٹنٹ پروفیسر بنادیا گیا۔ مجھے IER کے کئی شعبوں میں فلاسفی آف ایجوکیشن کا سبجیکٹ ماسٹرز کی کلاسز کو پڑھانے کا موقع تقریباً پندرہ بیس سال ملتا رہا۔ چنانچہ وہاں کے اساتذہ سے تعارف بھی ہوا اور فیکلٹی روم میں چائے کے ساتھ پروفیسر حضرات سے عمومی ملکی تعلیمی فضا اور فکری و نظریاتی مسائل پر بھی گفتگو رہتی۔ اس زمانے میں پروجماعت تنظیم اساتذہ بھی کافی متحرک تھی۔ چنانچہ دائیں اور بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے اساتذہ میں مکالمہ بھی ہوتا تھا۔ اس زمانے میں، اور اب بھی، IER اور فلسفہ ڈیپارٹمنٹ کو مکانی قربت حاصل ہے، جس کے سبب آنا جانا سہولت سے ہوجاتا تھا۔ ایک تعلیمی مشیر کی حیثیت سے پروفیسر ملک صاحب کی خدمات حکومتی اور غیر سرکاری شعبوں کو بہت طویل عرصے تک حاصل رہیں۔ نصاب کی ڈویلپمنٹ اور evaluation میں آپ کا خصوصی تجربہ اور اختصاص تھا۔ سیکنڈری سکول ایجوکیشن کے متعدد اہم پروجیکٹس پر بہت محنت سے کام کیا اور قابل تحسین رپورٹس مرتب کیں۔ پنجاب یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے آپ نے 1985ء تا 1988ء تدریس کی اور ریسرچ کے طلبہ و طالبات کو رہنمائی دی۔ پوسٹ گریجوایٹ طلبہ کو تحقیقی مقالات لکھنے میں آپ چار دہائیوں تک اعلیٰ ترین راہنمائی دیتے رہے۔ انہوں نے 1974ء میں امریکن یونیورسٹی، بیروت سے ماسٹرز جبکہ پوسٹ گریجوایٹ تعلیم سائنس ایجوکیشن میں 1983ء میں موناش یونیورسٹی، میلبورن (آسٹریلیا) سے حاصل کی جہاں زیادہ فوکس evaluation اور نصابی سکیموں پر تھا۔

مرحوم و مغفور کے جتنے رشحات ''البرہان'' کے صفحات کی زینت بنے ہیں، راقم انہیں بالاستیعاب پڑھ کر ہر تحریر میں حکمت و دانائی اور خلاّق ذہن کے گہرے اور پُربصیرت افکار سے استفادہ کرتا رہا ہے۔ اس بڑھاپے کی عمر میں بھی ان کا عزم و ارادہ اور جوشِ عمل قابل رشک تھا۔ اسلامی تہذیب و تمدن کی نشاۃ ثانیہ اور بے خدا علوم کو دین آشنا علوم بنانے میں مدیر ''البرہان'' کے ساتھ ان کے قلمی کروسیڈ کا محتوی کئی جلدوں میں مرتب ہوسکتا ہے جو ان دونوں حضرات کے گہرے دینی فہم، بے مثال لیاقت اور کمٹمنٹ کا گواہ ہوگا۔ مرحوم نے کام کرنے والوں کے لیے ایک روشن مثال چھوڑی ہے۔ وہ ایسے صاحبِ ایمان اور دین کے مخلص کارکن تھے جو کسی صلے اور نام و نمود کی خواہش کے بغیر اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ ''اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں'' کے مصداق انہوں نے علم، تعلیم و تعلم، تدریسی فرائض کی اہمیت، تعلیم کے نظری فریم

ورک کے ساتھ ساتھ مختلف کریکولمز کا جس باریک بینی سے تجزیہ کیا اور اپنے افکار سپردِ قلم کیے، ان سب میں ذہنی جلا، دل کا گداز، انسان دوستی، آخرت کی جواب دہی کے لیے تیاری اور رضائے الٰہی کا حصول گندھا ہوا ہے۔ پروفیسر ملک، ڈاکٹر محمد امین سے اتفاق کرتے ہوئے تعمیر و تربیتِ فرد کو مرکزی حیثیت دیتے ہیں۔ صحیح فکر اور گہرا یقین پہلے باطن میں تاثیر پیدا کرتا ہے اور پھر خارج میں تبدیلی کا مظہر ہوتا ہے۔ ملک صاحب مرحوم نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ وہ اچھے بھلے صاحب طرز ادیب معلوم ہوتے ہیں جن کی تحریریں مقصدیت، دردِ دل اور صلابت سے مملو ہیں۔

راقم کا مضمون فلسفہ ہے، جس کے لیکچرز اور سیمینارز میں نے کئی سال باضابطہ انگلستان میں سنے اور کتابوں کا مطالعہ کیا۔ لندن یونیورسٹی کے کنگز کالج میں تعلیم کے دوران راقم نے وہاں ان دنوں ایک فعال ریڈیکل فلاسفی گروپ کی میٹنگز میں بھی شرکت کر کے نوجوانوں کی محض کتابی اور باریک و جزرس تجزیاتی فلسفے کی سطحیت اور عملاً غیر ناقدانہ پرو اسٹیبلشمنٹ رویے کے خلاف احتجاجی رویے کا بھی مشاہدہ کیا۔ پاکستان واپسی پر ایک مضمون A Plea for Philosophy's Liberation تحریر کیا، جو چالیس سال قبل پنجاب یونیورسٹی کے آرٹس فیکلٹی جرنل میں شائع ہوا۔ میں نے اس میں فکر و تفلسف کے مغربی پیراڈائم کی نقالی یا اسارت سے نکل کر مختلف جیوفزیکل علاقوں کے فکری مثالیوں اور کلچرل/ اقداری بیانیوں اور بالخصوص اسلامی فریم ورک میں تفکر و تعقل کے ثمر آور ہونے کے دلائل دیے۔ تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض ہے کہ انگریزی زبان اور لٹریچر کے ایک بہت فاضل استاد نے اس مقالے سے متاثر ہو کر Indeginization of Knowledge کو اپنی علمی تگ و تاز کا موضوع بنایا۔ ورلڈ فلاسفی ڈے (18 نومبر) کو ان کا ایک لیکچر Delinking Philosophy from Coloniality پر ہو رہا ہے۔ وہ بجا طور پر یہ علمی رائے رکھتے ہیں کہ مغرب کا اپنے تہذیب و تمدن کے معیارات اور علمیاتی نقطہ نظر کو آفاقی سمجھنا بالکل غلط ہے۔ متعدد دانش ور اور مصنفین مغربی افکار کو "پراونشل" اور صرف تشدد اور طاقت کے بل پر عالمگیر بنانے کی کوشش سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ اگرچہ کالونائزڈ ممالک نے نام نہاد سیاسی آزادی تو حاصل کر لی، لیکن وہاں کی اشرافیہ ابھی تک اپنے مائنڈ سیٹ اور لائف سٹائل میں پورے طور پر coloniality کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

انھوں نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے میں بھی میرے مضمون کا حوالہ دیا ہے۔ بہرحال کہنے کا مقصد یہ ہے کہ بحمداللہ، تعلیم و تعلم کے میدان میں قرآنی فکر رکھنے والے خواتین وحضرات (جو اگرچہ تعداد میں بہت کم ہیں) مختلف عنوانات کے تحت کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ قوم کے نوجوانوں کو دینی سوچ اور ایمان ویقین کے ساتھ اچھے کردار و اخلاق کی تربیت بھی دیں۔

''البرہان'' کا زیرِنظر شمارہ پروفیسر ملک محمد حسینؒ کی یاد میں خصوصی شمارہ ہے۔ میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ مجھے بھی ماضی قریب میں کچھ لمحات ان کی معیت میں گزارنے کا شرف حاصل ہوا۔ دو تین برس قبل اسلام آباد میں ڈاکٹر محمد امین صاحب نے ایک سٹڈی سرکل/سیمینار کا اہتمام کیا تھا، جس میں ڈاکٹر صاحب کے علاوہ دوسرے اہم ترین مقرر کی حیثیت ملک صاحب کو حاصل تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تعلیم اور تعلیمی نظام کی زبوں حالی اور بے سمتی پر ملک صاحب نے بہت دل نشین انداز اور استدلال سے مرصع گفتگوئیں اور تشریحات کیں جن سے تمام شرکاء مستفید ہوئے۔

انجمن خدام القرآن جھنگ کے صدر انجینئر مختار حسین فاروقی (جو 13 ستمبر 2021ء کو اس دارِفانی سے کوچ کر گئے، اللہ انہیں غریق رحمت کرے) مختلف دینی، قومی وملی موضوعات پر گاہے گاہے مجالس منعقد کرتے رہے۔ ان کی دعوت پر ایک مجلس مذاکرہ میں راقم نے اپنی کار میں ملک صاحب اور اقبال اکیڈمی کے ڈاکٹر طاہر حمید تنولی کے ہمراہ لاہور سے جھنگ کا سفر اکٹھے کیا۔ آمد و رفت کے سفر میں ان دونوں فاضلین سے مصاحبت اور مختلف موضوعات پر بھرپور اور دلچسپ گفتگو ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ مخلص اور بے ریا دوستوں کے درمیان چند گھنٹے رہ کر زندگی کی خوب صورتی کا احساس ہوتا ہے۔ سنگل نیشنل کریکولم جس پر تحریک انصاف کی حکومت بہت بغلیں بجاتی ہے، پر تنقیدی جائزے کے سلسلے میں ایک نشست دس بارہ ماہ قبل سید مودودیؒ انسٹیٹیوٹ (نزد منصورہ) میں منعقد کی گئی۔ اس میں شرکت کے لیے پروفیسر ملک صاحب خوشاب سے شدرحال کر کے منصورہ پہنچے اور بہت سے نکات کی وضاحت، عمیق تجزیہ اور نقد و تبصرہ حاضرین کے گوش گزار کیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے خصوصی کرم سے ان کی بشری کمزوریوں سے درگزر فرمائیں اور مغفرت وانعام سے نوازیں۔ آمین، ثم آمین!

یادرفتگان

محمد یحییٰ رشید [1]

علم کا ایک اور آفتاب غروب ہوا

پروفیسر ملک محمد حسین مختصر سی علالت کے بعد دائمی راستے کے راہی ہوئے۔ ملک صاحب کے بارے میں کیا لکھوں؟ کوئی ایک پہلو ہو تو لکھنا بھی آسان ہوتا ہے۔ ان کی زندگی تو کئی پہلوؤں پر مشتمل تھی۔ وہ ایک مربی بھی تھے اور مذہبی سکالر بھی۔ ماہر تعلیم بھی تھے اور بہترین استاد بھی اور ان سب سے زیادہ وہ ایک بہترین انسان تھے۔

میرا ان سے تعارف ۱۹۹۹ء میں ہوا جب وہ اپنی ملازمت بطور ڈائریکٹر سٹاف ڈیولپمنٹ گورنمنٹ آف پنجاب چھوڑ کر (پری میچور ریٹائرمنٹ) خالصتاً تحریکی کام کے لیے تنظیم اساتذہ کے صدر کے حکم پر ''آفاق'' بنانے پر آمادہ ہوئے۔ میرا ان سے تعارف بھی آفاق کے لیگل معاملات کو دیکھنے کے حوالے سے ہوا اور پھر محبت اور شفقت کا یہ سلسلہ ۲۰ برسوں پر محیط ہو گیا۔ خوشاب کے گاؤں سندرال سے لے کر تنظیم اساتذہ کے رہنما تک کا سفر ان کی انتھک محنت، خلوص اور تحریک سے بے لوث محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ انہوں نے سکول ٹیچر سے اپنے کیئریر کا آغاز کیا اور پھر صوبہ بھر کے اساتذہ کو ٹریننگ دے کر استادوں کے استاد بھی قرار پائے۔

میں ان کے بارے میں کیا لکھوں کہ میرا قلم بہت چھوٹا ہے اور وہ آدمی بہت بڑے تھے۔ 'آفاق' کو جس طرح صرف ۲۳ لاکھ روپے کی قلیل رقم سے شروع کر کے پانچ سالوں میں ایک تن آور درخت بنا دیا اور اس کے اثاثے چند سالوں میں ۶ کروڑ سے تجاوز کر گئے یہ ان کی قائدانہ صلاحیت، تحریک سے خلوص اور بہترین ایڈمنسٹریٹر ہونے کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

آفاق کو پروان چڑھانے کے ساتھ ساتھ وہ آفاق ایجوکیشن بورڈ بنانے کی طرف گامزن تھے کہ تحریک کی طرف سے بنائے گئے صدرِ آفاق جناب حسن صہیب مراد (مرحوم) سے چند اصولی اختلافات ہو گئے۔ میری ذاتی رائے میں ملک صاحب چونکہ تعلیم کے میدان کے ایک

---

[1] ایڈوکیٹ ہائی کورٹ، لاہور

بڑے شہ سوار تھے اس لیے وہ اپنے دائرہ اختیار میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتے تھے۔ اس لیے یہ اختلاف شدت اختیار کر گیا اور پھر ملک صاحب نے تنظیم اساتذہ کے حکم پر آفاق کو خیر آباد کہہ دیا۔

میرے ایک دوست عبدالخالق صاحب نے ملک صاحب کی وفات پر تعزیتی پیغام لکھتے ہوئے فیس بک پر لکھا کہ ملک محمد حسین صاحب نے حسن صہیب صاحب مرحوم کی قیادت میں 'آفاق' کو پروان چڑھایا، تو میں نے فیس بک پر ہی ان کے اس فقرے کی تصحیح کی کہ حسن صہیب مرحوم کو یہ فخر رہا ہوگا کہ انہوں نے 'آفاق' میں پروفیسر ملک محمد حسین کی قیادت میں کام کیا۔ پروفیسر ملک محمد حسین تعلیمی دنیا کا وہ آفتاب تھا جس کی روشنی سے حسن صہیب مراد (مرحوم) اور ان جیسے سیکڑوں لوگوں نے استفادہ کیا۔

مجھے فخر ہے کہ وہ میرے رہنما، میرے بزرگ، میرے مربی اور میرے دوست تھے۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ انہوں نے بھی مجھ سے بے لوث محبت کی۔ ہفتہ میں ایک بار مجھے لمبی کال کرنا شاید انہوں نے اپنے معمول میں شامل کر رکھا تھا۔ 'آفاق' کو چھوڑنے کے بعد انہوں نے ایک اور ادارے کی بنیاد رکھی اور آفاق ہی کی طرح اسلامی مواد پر مبنی درسی کتابوں کی اشاعت کا کام شروع کیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ادارہ بھی اپنی جگہ بنانے لگ گیا لیکن ان کے ایک شاگرد کی وجہ سے وہ ادارہ خسارے میں چلا گیا۔ لیکن کمال یہ ہے کہ انہوں نے کبھی بھی اس بات کو اپنے دِل پر نہیں لگایا البتہ اس بات کا افسوس کرتے تھے کہ میرے شاگرد نے ایک بڑے ادارہ کو پنپنے نہیں دیا۔

پروفیسر ملک محمد حسین صاحب کو مردم شناسی میں بھی ملکہ حاصل تھا۔ دوران گورنمنٹ ملازمت وہ ساہیوال ایک ہائیر سیکنڈری سکول کا معائنہ کرنے گئے تو وہاں ایک نوجوان میتھ سبجیکٹ اسپیشلسٹ (SS) خالد محمود سے ملاقات ہوگئی۔ ملک صاحب نے پہلی نظر میں ہی خالد محمود صاحب کی صلاحیت پہچان لی اور ان سے پوچھا کہ کیا وہ لاہور آنا چاہتے ہیں؟ ان کی مرضی معلوم کرنے کے بعد انہیں اپنے پاس لاہور ٹرانسفر کروایا اور پھر نازک پودے کی طرح ان کی آبیاری کی۔ یہی SS خالد محمود صاحب ملک صاحب کی رہنمائی میں ڈاکٹر خالد محمود بنے اور پھر 'آفاق' کے بعد آغا خان فاؤنڈیشن میں ڈائریکٹر کے طور پر خدمات سرانجام دے کر انہوں نے اپنی ''فرم فیم

ایجوکیشن کنسلٹنٹس پرائیویٹ لمیٹڈ'' کی بنیاد رکھ کر حکومت پنجاب کے کئی پراجیکٹس پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔ دو ماہ قبل ڈاکٹر خالد محمود صاحب کینسر جیسے موذی مرض کا شکار ہو کر ابدی نیند سو گئے۔ میں کس کس کا ذکر کروں کہ ان کے شاگردوں کی ایک لمبی فہرست ہے جو ان کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔

'آفاق' میں ایک کمپیوٹر آپریٹر محمود نام کے نوجوان ساتھی تھے۔ انہوں نے ملک صاحب سے UMT سے کمپیوٹر سائنس میں ماسٹر کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ملک صاحب نے فوراً حسن صہیب مراد (مرحوم) سے بات کی اور اس نوجوان کو بغیر کسی فیس کے ایم سی ایس کروا دیا۔ اور یوں وہ نوجوان ملک صاحب کی بدولت آجکل ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ڈسٹرکٹ آفیسر انفارمیشن ٹیکنالوجی کی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔

ایک اور نوجوان جو آجکل البرکہ بنک جڑانوالہ میں کلسٹر منیجر ہے یعنی چار برانچز اس کی سربراہی میں ہیں، شفقت محمود علوی، اس کے بقول میں نے ڈرافٹنگ کا فن 'آفاق' میں رہتے ہوئے ملک محمد حسین صاحب سے سیکھا۔ وہ مجھے لیٹر لکھنے کے لیے دیتے اور پھر غلطیاں نکال کر واپس دیتے۔ اس طرح میری ڈرافٹنگ اتنی اچھی ہوگئی ہے کہ البرکہ بنک میں مجھے کمیونیکیشن کرتے ہوئے کوئی پرابلم نہیں ہوتی۔

ملک صاحب کے دوست سید وقار علی کاری صاحب کے بقول کہ اگر یونیورسٹی پروفیسرز کے وہ مقالے جو Ph.D میں انہوں نے لکھے ہیں ملک محمد حسین صاحب کو Review اور نظر ثانی کے لیے دیئے جاتے تو ایک بڑی تعداد میں مقالے Reject ہو جاتے۔

ان کے کس کس پہلو کو اُجاگر کروں۔ پاکستان کی تعلیمی پالیسیوں پر جتنی گہری نظر ان کی تھی اب تو کوئی دوسرا ایسا شخص نظر نہیں آتا جو اتنی باریک بینی رکھتا ہو۔

وہ سنگل نیشنل کریکولم (SNC) کے حامی تھے لیکن اس میں ہیومنزم کی جو بنیاد ڈالی گئی اس کے سخت مخالف تھے۔ کئی بار پروفیسر رفیق طاہر صاحب کے لتے لیتے کہ آپ کے ہوتے ہوئے یہ پراجیکٹ پاس کیسے ہوا؟ (یاد رہے کہ پروفیسر رفیق طاہر صاحب SNC کے انچارج تھے) اللہ کو کیا جواب دو گے؟ SNC کے موضوع پر ماہنامہ 'البرہان' میں مسلسل لکھتے رہے۔

ڈاکٹر محمد امین صاحب مدیر ماہنامہ 'البرہان'، ملک محمد حسین صاحب اور فدوی نے جب قرآن حکیم کے ترجمہ کے پراجیکٹ کو شروع کیا تو ملک محمد حسین صاحب نے آگے بڑھ کر اس پراجیکٹ کی باگ ڈور سنبھالی اور مرتے دم تک اس پراجیکٹ کو پھیلانے اور سکولوں تک پہنچانے کی سعی میں لگے رہے۔

بیمار ہونے سے ایک ہفتہ قبل مجھ سے فون پر لمبی بات کی اور اس گفتگو کا محور ومنشا صرف اور صرف ترجمۂ قرآن پراجیکٹ تھا۔قرآن پراجیکٹ کے لیے کراچی سے برادرم عابد چوہدری صاحب کو لاہور شفٹ کروانے پر مجھ سے مشاورت کے لیے انہوں نے جوہر آباد سے لاہور آنا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور منظور تھا۔ وہ آناً فاناً اللہ سے ملاقات کے لیے حاضر ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو منور کرے۔ان کی کوششوں کو قبول فرمائے اور بشری کوتاہیوں کو معاف فرمائے، آمین۔

میں اکثر انہیں ایک مثالی سکول کھولنے کا کہتا رہتا تھا لیکن ان کا ہمیشہ یہی جواب رہا کہ میں ''تعلیم فروشی نہیں کر سکتا'' جب بھی سکول بناؤں گا تو تعلیم اس میں فری ہوگی۔ وہ رجال کار کی تیاری کے لیے ایک دینی تعلیمی ادارہ بنانے کے خواہشمند تھے لیکن زندگی نے انہیں مہلت نہ دی۔

پروفیسر ملک محمد حسین اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔تعلیم کے میدان کے شہسوار تھے۔ ریسرچ ان کا خاص موضوع تھا۔ بہترین لکھاری تھے۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں انہیں ملکہ حاصل تھا۔ مولانا مودودیؒ کے شیدائی تھے۔ ایک دفعہ ڈاکٹر امین صاحب نے ماہنامہ البرہان میں مولانا کی سیاست میں اجتہادی غلطی کے نام سے مضمون لکھا تو میرے سامنے ڈاکٹر امین صاحب کو کھری کھری سنا دیں۔

اپنی ذات کے لیے کبھی بھی نفع حاصل کرنے کی کوشش نہ کی۔ ان کے بیٹے برخودار حسیب نے جب UMT میں ٹیکسٹائل انجینئرنگ میں داخلہ لیا تو میں نے کہا کہ آپ حسن صہیب مراد مرحوم سے صرف بات کر لیں تو حسیب فری پڑھ جائے گا۔ لیکن انہوں نے بات نہ کی اور مکمل فیس دے کر حسیب کو ٹیکسٹائل انجینئرنگ UMT سے کروائی۔ دوسری طرف 'آفاق' کے ملازم محمود کے لیے حسن صہیب مراد (مرحوم) کے پاس جا کر اس کی مکمل فیس معاف کروائی۔

(بقیہ صفحہ نمبر: ۱۷)

یادرفتگان ڈاکٹر صاحبزادہ انواراحمد بگوی[1]

آہ پروفیسر ملک محمد حسین مرحوم!

پرانے بادہ خوار نہ لوٹنے والے سفر پر روانہ ہوتے جارہے ہیں مگر ان کے متبادل یا مترادف کا دور دور تک کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ یہ قومی بلکہ ایک انسانی المیہ ہے جس سے پاکستان بالخصوص تیزی سے شکار ہو رہا ہے۔ ستم یہ کہ ایسی محرومی کا احساس زیاں بھی مفقود ہے ورنہ امید کی کرن کہیں تو ضرور نظر آتی۔ اس زیاں کا تازہ زخم پروفیسر ملک محمد حسین کی رحلت ہے۔

ملک صاحب سے میرا تعارف اتنا پرانا نہیں ہے لیکن جب تعارف ہوا اور انہیں پڑھا اور سنا تو جانا کہ یہ رشتہ تو بہت پرانا ہے۔ ان کے ساتھ پہلی ملاقات ماہنامہ" سوئے حرم" کے بانی مدیر استاد محمد صدیق بخاری صاحب کے گھر بلکہ ان کی مسجد میں ہوئی۔ بخاری صاحب نے اپنے گھر کو ایک کونے میں سمیٹا، دوسرے حصے میں پبلک لائبریری بنائی اور اس کے اوپر محلے والوں کے لئے مسجد بنا دی۔ انہوں نے یہ سارے کام للہ فی اللہ صرف اپنے محدود وسائل سے سرانجام دیئے۔" تاریخ سرگودھا" کے حوالے سے پروفیسر صاحب میری ایک کتاب سے متعارف تھے۔ بھیرہ اور بگہ کے حوالے سے بگویہ خاندان سے بھی واقف تھے۔ میں ان کی تحریریں ماہنامہ" البرہان" اور افکار معلم" میں پڑھ چکا تھا۔ اس کے بعد چند بار بانی مدیر" البرہان" پروفیسر ڈاکٹر محمد امین صاحب کے فکری فورم پر رابطے کا موقع ملا۔ بعدازاں جوہر آباد سے فون پر کبھی کبھی ان کے ساتھ لمبی ملاقات ہوتی رہتی تھی خصوصاً جب کسی قومی یا سیاسی مسئلے پر تبادلہ خیال مقصود ہوتا۔

پروفیسر ملک مرحوم حد درجہ مخلص، فاضل، قوم کے درد آشنا، علم دوست اور راست فکر دانشور تھے۔ اصلاح معاشرہ اور تعلیم ان کے بنیادی موضوع تھے۔ تعلیم میں نصاب، اساتذہ کی تربیت اور طلبہ کی نشوونما پر خصوصاً لکھتے رہے۔ اصلاح معاشرہ کے لئے مساجد اور مدارس کے کردار پر بہت زور دیتے رہے۔ درس نظامی کے نصاب میں عصری تقاضوں کے مطابق تبدیلی بھی ان کے زیر غور رہتی تھی۔

[1] مصنف، دانشور، چیف ایگزیکٹو منصورہ ٹیچنگ ہسپتال، لاہور

گزشتہ سال سے وہ متعدد بار منصورہ ٹیچنگ ہسپتال لاہور میں تشریف لائے، اپنے علاج معالجے کے لئے نہیں کیونکہ بنظر ظاہر وہ صحت مند اور مستعد تھے۔ انہوں نے کبھی کسی جسمانی تکلیف یا عارضے کی شکایت نہیں کی البتہ کبھی اپنے ماموں استاد ملک امیر حسین صاحب کے آپریشن کے سلسلے میں اور کبھی دوسرے عزیزوں کے علاج کے لئے ہسپتال میں آتے رہے۔ جہاں وہ ہسپتال کی صفائی، نظم ونسق اور سہولیات پر اطمینان کا اظہار کرتے تھے وہاں ان کے زبان سے کبھی نکتہ چینی نہیں سنی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان سے کسی معاصر کا شکوہ گلہ بھی نہیں سنا۔ جیسے وہ سب کے لئے خیر طلب اور دعا گو ہوتے تھے مگر جہاں اصولوں کی پاسداری یا پامالی کا معاملہ ہوتا وہ بے لاگ اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔

موجودہ حکومت کے سنگل نیشنل کریکولم (SNC) کے حوالے سے مرحوم نے ایک قومی موقف اتنی وضاحت، دلسوزی اور دلیل کے ساتھ پیش کیا کہ اس موضوع پر ان کی آواز سب سے توانا محسوس ہوئی۔ اوروں نے بھی لکھا مگر جتنی دلسوزی، تعمق اور دلائل سے ملک صاحب نے لکھا وہ سب سے منفرد تھا چنانچہ ان کے خیالات ملک کے سنجیدہ رسائل میں شائع ہوئے۔ ملک صاحب کی طبیعت کی سادگی، ملنے میں اپنائیت اور گفتگو کی شائستگی بہت متاثر کن تھی۔ وہ حد درجہ خلیق اور متواضع تھے۔ مل کر کبھی احساس نہ ہوتا کہ وہ ایک بہت بڑے ماہر تعلیم اور اسلامی دانشور ہیں۔

ملک صاحب مرحوم کو مدیر "البرہان" کی طرح مساجد، مدارس اور مولوی صاحبان کے عملی کردار کے بارے میں شدید تحفظات تھے۔ ان پبلک فورموں کے ناکافی اور اکثر نامناسب استعمال پر وہ شاکی تھے۔ وہ اپنا موقف بڑے مضبوط اعداد وشمار سے بیان کرتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی بات تھی بھی بالکل درست کیونکہ ملک کی لاکھوں مساجد، ہزاروں مدارس ومکاتب اور لاکھوں مولوی صاحبان کے ہوتے ہوئے ملک میں فرقہ واریت، بداخلاقی، بدعنوانی، معاشرتی بگاڑ اور نقلی مذہبیت (Religiosity) کیوں روز افزوں ہے؟

فرد کی اصلاح کیوں نہیں ہو پاتی؟ مذہبی حلقوں میں منافقت کیوں بڑھ رہی ہے؟ اسلامی اقدار کے حوالے سے معاشرے میں کوئی تبدیلی یا بہتری کیوں نظر نہیں آتی؟ ہمارے اردگرد اور ہمارے زیر اثر مغربی تہذیب وتمدن کی یلغار کیوں بڑھتی جارہی ہے؟

ہر ہفتے ملک بھر میں لاکھوں کی تعداد میں جمعہ کے خطبے تقریریں، صوفیا کے حلقے اور وعظ، مجالس ذکر وفکر، محافل نعت وقوالی اور نجانے دین اور تصوف کے نام پر کیا کیا مصروفیات (Engagements) رائج ہیں مگر مجال ہے کہ مولوی کا مزاج بدلا ہو یا صوفی نے اپنے باطن سے باہر جھانکا ہو یا قوم کی اخلاقی طور پر کچھ اصلاح ہوئی ہو۔ ملک صاحب محکمہ تعلیم میں سروس سے ریٹائرمنٹ کے بعد چاہتے تو آسانی سے لاہور میں Settle ہو سکتے تھے مگر انہوں نے اپنے آبائی شہر جوہر آباد کو ترجیح دی۔ ان کے پیش نظر علاقے کی خدمت اور تعلیم کا فروغ تھا چنانچہ وہاں اپنی سوچ کے مطابق انہوں نے لڑکے لڑکیوں کے لئے معیاری درسگاہیں بنائیں اور بساط بھر قلم اور عمل سے اصلاح تعلیم کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ تعلیم کو آمدن اور کاروبار کا ذریعہ نہیں بنایا، خدمت اور قومی فلاح کا ذریعہ بنایا۔

جب سے پروفیسر ملک محمد حسین صاحب ماہنامہ" البرہان" لاہور کے نائب مدیر مقرر ہوئے تھے وہ باقاعدگی سے نظام تعلیم، نصاب تعلیم، اصلاح تعلیم اور اصلاح معاشرہ، طلبہ اور اساتذہ کی تربیت پر لکھتے رہے۔ اساتذہ کی تربیت، بچوں کی اخلاقی تربیت، معاشرتی اور سماجی اصلاح کے لئے، سیاسی مذہبی جماعتوں کا کردار اور ان میں اصلاح کی ضرورت، جس میں فرد اور معاشرے کو فوکس کیا جائے، جیسے موضوعات پر اظہار خیال کرتے رہے۔ چنانچہ مولانا عبدالغفار حسن مرحوم سابق امیر جماعت اسلامی پاکستان کے ایک مضمون" جماعت اسلامی۔ کل" کے مضمون کے تقابل کے طور پر ملک صاحب کا مضمون اکتوبر 2021ء کے شمارے میں شائع ہوا جس کا عنوان تھا" جماعت اسلامی۔ آج "۔ اس مضمون کے مندرجات جانے پہچانے تھے، پیدا ہونے والے اشکالات اور سوالات کے ساتھ ممکنہ جوابات اور حل بھی پرانے تھے مگر بعض حلقوں کو وہ خیالات پسند نہ آئے۔ اثنائے گفتگو جب انہوں نے اس منفی Development کا ذکر کیا تو وہ اپنی تحریر کے مندرجات اور اپنے مخلصانہ خیالات پر مکمل طور پر مطمئن تھے مگر اس بات پر ضرور متفکر تھے کہ اب داخلی احتساب وانتقاد اور تبدیلی وترقی کا سلسلہ جیسے سرے سے منقطع ہو چکا ہے۔ گویا اب اداروں میں اصلاح اور ترقی کی راہیں مسدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ ایسے طرز عمل کے انجام سے کون ناواقف رہ سکتا ہے؟

آج جب ہر دوسرا ڈگری یافتہ خود کو ماہر تعلیم سمجھتا اور کہلاتا ہے، ملک محمد حسین صاحب کی

رحلت سے ملک اور قوم فی الواقع ایک دردمند استاد، ایک مخلص مفکر اور ایک حساس ماہر تعلیم اور ایک سچے پاکستانی سے محروم ہوگئے ہیں۔ ملک صاحب جریدہ 'البرہان' کے نائب مدیر کے ساتھ تحریک اصلاح تعلیم کے جنرل سیکرٹری اور اساتذہ کی معروف جماعت 'تنظیم اساتذہ پاکستان' کے مقتدر رہنما بھی تھے۔ ملک صاحب اکتوبر کے آخری ہفتے میں اپنے ماموں استاد اور مربی کے علاج کے لیے لاہور آئے ہوئے تھے۔ اچانک ایک صبح اٹھے تو بستر سے اٹھ نہ سکے۔ ان پر فالج کا حملہ ہوگیا تھا۔ علاج کے لیے فوری طور پر ایک پرائیویٹ ہسپتال میں داخل ہوئے لیکن ڈینگی بخار کا شکار ہوگئے اور بالآخر ڈینگی بخار کی پیچیدگیوں کے باعث 29 اکتوبر 2021ء کو سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔ اللّٰھم اغفر لہ۔

اسلامی افغانستان۔تعلیم وتربیت کی اہمیت

امیر المؤمنین ہبۃ اللہ اخندزادہ کا پیغام

تعلیم وتربیت کے شعبے پر امارت اسلامیہ خاص توجہ دیتی ہے۔ جب تک ہمارا ملک تعلیمی لحاظ سے ترقی نہیں کرے گا ہم معاشی اور معاشرتی طور پر ترقی نہیں کرسکتے۔ معاشی استقلال اور خودکفیل بننے کے لیے تعلیمی اداروں کی سرگرمیاں، اپنی اولاد کو تمام تعلیمی شعبوں میں تربیت دینا، خاص طور پر دینی لحاظ سے اولاد کی تعلیم وتربیت اور جدید علوم کے شعبے میں ترقی وہ چیز ہے جس کی اہمیت امارت اسلامیہ سے مخفی نہیں اور ہم اس کی ترقی کے لیے کوشاں ہیں۔

اس حوالے سے مجاہدین کو ہماری ہدایت یہ ہے کہ امارت اسلامیہ کے ماتحت علاقوں میں دینی اور عصری علوم کے سلسلے پر خصوصی توجہ دیں۔ مدارس دینیہ، سکول، کالج اور یونیورسٹیاں کھلی رکھیں۔ معاملات کی آسانی میں ان کے ساتھ تعاون کریں۔ علماء کرام، جدید علوم کے اساتذہ، یونیورسٹیوں کے پروفیسرز اور ممتاز علمی شخصیات کی عزت کریں۔ معاشرے کے لیے ان کی بیش بہا خدمات کا احساس کریں اور ان کی ضروریات کی تکمیل کے لیے حتیٰ الامکان ان کا ہاتھ بٹائیں۔

(ماہنامہ شریعت اکتوبر ۲۰۲۱ء)

اسلامی تحریکیں　　پروفیسر ملک محمد حسین مرحوم

عالمی اور مقامی مقتدرہ کا جبر
اور اسلامی تحریکوں کے لیے راہِ عمل
[البرہان کے لیے پروفیسر ملک محمد حسین مرحوم کی آخری تحریر]

اللہ کی زمین پر اللہ کی حکمرانی، اللہ کے دین کی حکمرانی، فریضۂ اقامت دین کا بنیادی تقاضا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ طاغوت اپنے گماشتوں کے ذریعے قدم قدم پر راہ روکے کھڑا ہے۔ طاغوت اپنی مہیب شکل میں عالمی مقتدرہ کے روپ میں روبہ عمل ہے۔ مختلف اسلامی ملکوں میں مقامی مقتدرہ، عالمی مقتدرہ کی خدمت اور معاونت میں سرگرم ہوتی ہے۔ سب سے پہلے ہم عالمی مقتدرہ کے اعضاو جوارح اور ان کی سر پرستی کرنے والی عالمی قوت پر نظر ڈالتے ہیں۔

عالمی مقتدرہ کا ڈائریکٹر جنرل یا سر پرست اعلیٰ اس وقت ریاست ہائے متحدہ امریکہ ہے۔ کچھ عرصہ پہلے روس بھی ایک حلقے کو قابو کرتا تھا لیکن سوویت روس کے انہدام کے بعد امریکہ تنہا سپر طاقت کے طور پر سامنے آیا۔ اب کچھ حالات بدل رہے ہیں اور شاید کچھ عرصے کے بعد چین اور روس بھی عالمی طاغوت کے طور پر سامنے آجائیں۔ بہر حال اس وقت امریکہ کی عالمی منظر نامے پر حکمرانی ہے۔ عالمی مقتدرہ کا سب سے مضبوط اور ہمہ گیر آرگن اقوام متحدہ کا ادارہ ہے۔ اقوام متحدہ کے ذریعے سے بین الاقوامی کنونشنز اور بین الاقوامی معاہدے بین الاقوامی قانون کی شکل میں دنیا میں نافذ ہوتے ہیں اور اس طرح ریاستوں کو بین الاقوامی قانون، معاہدوں اور کنونشنز میں جکڑا جاتا ہے۔ اس طرح قومی خودمختاری (Nation alovereignity) کا بہت بڑا حصہ بین الاقوامی یا عالمی مقتدرہ کے پاس چلا جاتا ہے۔ اس کے لیے ورلڈ بنک، ایشین ڈویلپمنٹ بنک، آئی ایم ایف، انٹرنیشنل فنانس کارپوریشن، یونیسکو، یونیف، ورلڈ ہیلتھ آگنائزیشن، ورلڈ فوڈ پروگرام، یو این ڈی پی، فیٹف (FATF) اور اسی طرح کے کئی دیگر بین الاقوامی ادارے ہیں جو قومی ریاستوں کو عالمی مقتدرہ کے پنجۂ اقتدار میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد بین الاقوامی این جی اوز ہیں اور ترقی یافتہ ملکوں کے بین الاقوامی ترقی کے ادارے ہیں جو امداد اور ترقی کے نام پر ملکوں کو اپنے

حلقۂ اثر میں رکھتے ہیں۔ خود امریکہ نے بعض ادارے بنا رکھے ہیں جو قومی ریاستوں خصوصاً اسلامی ملکوں کو امریکی ڈکٹیشن پر مجبور کرتے ہیں مثلاً یو ایس ایڈ ہے۔ یو ایس کمیشن برائے انٹرنیشنل ریلیجس فریڈم ہے۔ خود سی آئی اے اور امریکہ کا فوجی ادارہ پنٹیگان کھلم کھلا دوسرے ملکوں کے اندرونی معاملات میں جارحانہ دخل اندازی کرتا ہے۔ بعض ممالک بھی عالمی مقتدرہ کی خدمت کے لیے اپنا اثر ورسوخ اور مالی خدمات پیش کرتے ہیں۔ اس طرح عالمی مقتدرہ ایک ایسی عالمی طاقت کی شکل اختیار کرلیتا ہے کہ اس کی مرضی کے بغیر کوئی حکومت اپنی خود مختاری کے تحت اپنا نظامِ حکومت نہیں چلا سکتی۔

مقامی مقتدرہ

عالمی مقتدرہ کے سہولت کار ہر ملک میں موجود ہوتے ہیں۔ اس طرح عالمی مقتدرہ کو صرف خواہش کا اظہار کرنا ہوتا ہے اور اس خواہش کے حصول کے لیے مقامی مقتدرہ پوری سرگرمی اور جذب اندروں کے ساتھ کمر بستہ ہوتی ہے۔ مقامی مقتدرہ میں سب سے اہم ادارہ فوج اور سول بیوروکریسی ہے۔ ان کی معاونت کے لیے مقامی این جی اوز ہوتی ہیں جو زیادہ تر بین الاقوامی این جی اوز کی سرپرستی میں کام کرتی ہیں۔ سیاستدان ہوتے ہیں جو بین الاقوامی مقتدرہ اور مقامی مقتدرہ کے سامنے ہر وقت سر جھکانے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ اسلامی لابی کے بعض بااثر کارندے بھی قومی اور اسلامی جوش وجذبے کے تحت دل وجان سے تعاون کرتے ہیں۔ اسلامی ملکوں میں قومی معاشروں کا تانا بانا اتنا کمزور ہے کہ کسی بھی منظم قوت کے لیے اس میں مداخلت اور اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ بعض افراد اپنے ذاتی مفاد کی خاطر اپنے ذاتی رجحانات اور نظریے کے خلاف بھی کام کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں کیونکہ مقامی مقتدرہ اور اس کے اعضاء وجوارح کے پاس دینے کے لیے بہت کچھ ہوتا ہے۔

تحقیق وجستجو اور معلومات کے حصول کا وسیع نیٹ ورک

عالمی مقتدرہ محض قوت اور طاقت کے بل بوتے پر ہی کام نہیں کرتی بلکہ وہ یونیورسٹیوں، اور تحقیقات اداروں کے ذریعے ان معاشروں کے تانے بانے کا وسیع اور گہرا مطالعہ کراتی ہیں اور معلومات کی بنیاد پر اقدامات کے ایک سلسلہ کا اہتمام کرتی ہیں۔ ان کے پاس کمزوریوں اور

مضبوطیوں کی پوری معلومات ہوتی ہیں جن کو کام میں لاکر وہ ترقی پذیر ملکوں خصوصاً اسلامی ملکوں میں اپنی مرضی نافذ کرتی ہیں۔

پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا

عالمی مقتدرہ اور مقامی مقتدرہ کا سب سے اہم اور سب سے مضبوط ہتھیار پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا کا حلقۂ اثر اب بہت پھیل چکا ہے۔ خصوصاً سوشل میڈیا اب تباہی ڈھا رہا ہے۔ ٹی وی چینلز دن رات ایک خاص رنگ میں کے ڈِس انفارمیشن پھیلانے میں مصروف رہتے ہیں اور ان میں سے اکثر عالمی مقتدرہ کے زرخرید غلام ہوتے ہیں۔ مقامی مقتدرہ خریدنے سے زیادہ طاقت اور دباؤ سے کام کرتی ہے۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا تقریباً سو فیصد اسلام مخالف لابی کے ہاتھوں میں ہے۔ کہیں دو چار اسلامی ذہن کے لوگ ہیں بھی تو وہ بھی ماحول کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہی راگ لاپتے ہیں جو سیکولر، لبرل اور اسلام دشمن لوگوں کا رات دن کا شیوہ ہوتا ہے۔ بعض واقف حال لوگوں کے مطابق الیکٹرانک میڈیا تو عالمی طور پر چند ایک یہودی سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں ہے۔ جب صورتِ حال یہ ہے تو اس سے کس خیر کی توقع کی جاسکتی ہے؟ آلودہ معلومات اور پہلو دار تجزیوں کے ساتھ فحاشی اور عریانی سے بھرے دیگر پروگرام کسی خیر کے لیے جگہ اور موقع چھوڑتے ہی نہیں۔

اسلامی قوتوں کے کام کرنے کا ماحول

یہ ہے وہ عالمی اور مقامی سطح کا ماحول جس میں اسلامی قوتوں نے کام کر کے اپنے معاشروں میں اقامت دین کا کام کرنا ہوتا ہے۔ ہم یہاں پر دیگر اسلامی ملکوں کے معاملات کو ایک طرف رکھتے ہوئے پاکستان کی بات کرتے ہیں۔ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا۔ جہاں کی ۹۷ فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ پاکستان کے آئین نے اسلام کو بطور مذہب قبول کیا ہوا ہے اور آئین اپنی ساخت کے لحاظ سے بہت حد تک اسلامی ہے یعنی پاکستانیوں کا سوشل فیبرک اسلامی اصولوں پر مبنی ہے۔ ملک کا کوئی گاؤں، محلہ، ڈیرہ، ڈھوک یا گوٹھ ایسی نہیں جہاں مسجد نہ ہو۔ مسجد اسلام کا سمبل ہے جس سے معاشرے کی ساخت کا پتہ چلتا ہے۔ پانچ وقتی نمازوں میں حاضری کم بھی ہو تو جمعہ کی نماز میں مساجد بھر جاتی ہیں بلکہ اکثر مقامات پر مسجد سے باہر بھی صفیں

بجھی ہوتی ہیں۔ پانچ وقت کی اذانوں کا سلسلہ پتہ دیتا ہے کہ یہ ملک مسلمانوں کا ملک ہے۔ دروسِ قرآن کی ہزاروں محفلیں ہر روز برپا ہوتی ہیں۔ جمعہ کے خطبے ہیں کہ باقاعدگی سے ارشاد کیے جاتے ہیں۔نعت کی محفلوں کی گنتی مشکل ہے۔محرم کا عشرہ ہو یا ربیع الاوّل کے بارہ دن دینی پروگراموں کا ایک سماں بندھا ہوتا ہے۔تبلیغی جماعت، دعوتِ اسلامی، جماعت اسلامی اور دیگر اسلامی گروہوں کی روح پرور سرگرمیاں اور لاکھوں پر مشتمل اجتماعات ایک ایسا منظر پیش کرتے ہیں کہ قلب وجگر میں ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے لیکن اس سب کے باوجود عدالت، معیشت، معاشرت اور اجتماعیت پر سیکولر لبرل رنگ غالب ہے تعلیم وتہذیب مغرب کی آئینہ دار اور پارلیمانی نظام مغربی جمہوریت کے شکنجہ میں ہے۔اجتماعیت پر اسلامی قوتوں کا اختیار ناپید اور ملکی نظام پر عالمی مقتدرہ اور مقامی مقتدرہ کا غلبہ ہمہ گیر ہے۔

ایسا کیوں ہے؟

ایسا اس لیے ہے کہ عالمی مقتدرہ اور مقامی مقتدرہ کو ہمارے دروسِ قرآن، ہماری محافل نعت، ہمارے جمعہ کی نمازوں، ہمارے لاکھوں کے تبلیغی اجتماعات اور ہماری مساجد کے میناروں سے لینا دینا نہیں۔بس انہوں نے ہماری تعلیم، ہماری معیشت، ہماری معاشرت، ہماری قانون سازی، ہماری داخلی اور خارجی پالیسی اور ہمارے تقسیم دولت کے نظام سمیت ہمارے دفاعی نظام کو اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے اور ایسا اس لیے ہے کہ ہماری اسلامسٹ لابی کے پاس نہ تو معلومات ہیں اور نہ ہی صلاحیت کہ وہ معاشرے کے اہم اور حساس معاملات پر اپنے فکر وعمل کا اثر ڈال سکیں۔نعرہ بازی ہے، جذباتی استحصال ہے اور پرچم لہرانے کا مقابلہ ہے، بیان دینے کا شوق ہے اور گہرائی میں جا کر معاملات کے سمجھنے کی ضرورت کا احساس ہی نہیں۔ عالمی مقتدرہ اور مقامی مقتدرہ علم کی بنیاد پر اقدام کرتی ہے۔اسلامی قوتوں کو بھی علم کی بنیاد پر آگے بڑھنا ہوگا۔عالمی اور مقامی مقتدرہ خاموشی سے نفوذ کرتی ہے، اسلامی قوتوں کو بھی شور وغوغا کیے بغیر خاموشی سے راستہ بنانا ہوگا۔عالمی اور مقامی مقتدرہ اپنی مرضی کے رجال کار تیار کر کے انہیں کنٹرولنگ پوزیشن پر فائز کرتی ہے۔اسلامی لابی کو بھی اسلامی جذبے سے سرشار اور علوم حاضرہ سے لیس رجال کار تیار کرنا ہوں گے اور انہیں خاموشی سے سسٹم کے اندر داخل کرنا ہوگا تا کہ تدریجی انقلاب کی راہ ہموار کی جا سکے۔عالمی اور مقامی مقتدرہ منظم ہے، متحد ہے اور منصوبہ بند ہے۔اسلامی لابی کو بھی منظم، متحد ہو

کر اور منصوبہ بندی کے ساتھ آگے بڑھنا ہوگا۔ عالمی اور مقامی مقتدرہ اپنے بیانیے پر قائم اور اسے روبعمل لانے کے لیے مسلسل کام کرتی ہے۔ اسلامسٹوں کو بھی اپنے بیانیے یعنی فریضۂ اقامت دین، جس کا مطلب ہے اللہ کی حکمرانی اور اللہ کے دین کی حکمرانی، پر قائم رہتے ہوئے اس کے نفاذ کے لیے مسلسل کوشش کرنا ہوگی۔ اس بیانیے کے لیے معاشرے میں عصبیت پیدا کرنی ہوگی تاکہ لوگوں کا قلب وذہن اس بیانیے سے سرشار ہو اور وہ اس کے حصول کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دیں۔ عالمی مقتدرہ اور مقامی مقتدرہ کو سمجھے بغیر اور تحقیقی معلومات پر مبنی حکمت عملی بنائے بغیر نیز لوگوں کے ذہنوں میں اسلام کا صحیح تصور پیدا کیے بغیر اور ان کے ذہنوں میں اسلامی قیادت کا مثبت امیج پیدا کیے بغیر اگر جدوجہد کی جائے گی تو وہ سطحی کام ہوگا۔ اس مقصد کے لیے دو ہی وسیلے ہیں تعلیم اور مسجد۔ ان وسیلوں سے صرف نظر کرکے کامیابی کا خواب ہی دیکھا جاسکتا ہے حقیقی کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ تبدیلی کا راستہ طویل ہے اور تدریج کا تقاضا کرتا ہے۔ تعلیم، تحقیق اور رجالِ کار کی فراہمی کے بغیر کوئی تبدیلی نہیں لائی جاسکتی۔ خاموشی سے بنیادی کام کرنے کی پالیسی اپنانا ہوگی۔ شوروغوغا، احتجاج اور نعرہ بازی رکاوٹیں کھڑی کرتی ہے۔ نظر نہ آنے والا افرادِ کار کا ایک گروپ جس کی اسلامی تصورِ حیات پر گہری نظر، عالمی تناظر کا وسیع علم اور تزکیہ نفس پر مبنی مضبوط کردار ہو اگر تسلسل سے ادارہ جاتی بنیادوں پر کام کرے تو پندرہ سے بیس سالوں میں رجال کار کی ایک مؤثر قوت تیار کی جاسکتی ہے۔ ہر قسم کے میڈیا سے دوری ضروری ہے۔ بے معنی فتوحات کے ذکر سے اجتناب کرنا ہوگا۔ سُلا دینے والی رویاں بند کرنا ہوں گی اور شخصیات کو عوام کا نورِ نظر بنانے کی بجائے نظریے اور نصب العین کو لوگوں کا رہنما بنانا ہوگا۔ سید مودودی کی فکر کو مرکزی حیثیت دیتے ہوئے دیگر قدیم اور جدید، مقامی اور عالمی مفکرین اسلام سے استفادہ کرنا ہوگا۔ ضرورت قلب وذہن کو بدلنے کی ہے اور اسلام کے لیے خالص اور پائدار جذبہ پیدا کرنے کی ہے۔ محض ریلیاں، جلسے جلوس، طنز وتشنیع سے لبریز بلند آہنگ خطابات، زندہ مردہ باد کے نعرے اور پرچم لہرانے کے مقابلوں سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اللہ ہم پر رحم کرے اور اللہ ربّ العزت کی ذات ہماری حامی وناصر ہو۔

یادرفتگان　　مدیر

تعزیتی ریفرنس

پروفیسر ملک محمد حسین مرحوم

پروفیسر ملک محمد حسین مرحوم پچھلے ۱۴ سال سے تحریک اصلاحِ تعلیم کے جنرل سیکرٹری اور ۲۰۱۶ء سے البرہان کے نائب مدیر تھے۔ وہ میرے دست راست اور تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ کے روحِ رواں تھے اور ہم دن رات اکٹھے کام کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد میرے لیے ان کے لیے تعزیتی ریفرنس کا انعقاد بالکل مشکل نہیں تھا لیکن پتہ نہیں کیوں میرے دل میں خیال آیا کہ انہوں نے زندگی کا بڑا حصہ تنظیم اساتذہ کے ساتھ گزارا تو تحریک اصلاحِ تعلیم ان کے لیے تعزیتی ریفرنس کا اہتمام تنظیم اساتذہ سے مل کر کرے۔ ویسے بھی تنظیم سے ہمارا کوئی اختلاف اور چپقلش نہ تھی۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اگر ملک صاحب مرحوم جماعت اسلامی اور تنظیم اساتذہ سے اور ان کی کارکردگی سے مطمئن ہوتے اور ان سے مایوس نہ ہوتے تو میرے ساتھ مل کر تحریک اصلاحِ تعلیم کا پلیٹ فارم استعمال نہ کرتے، لیکن اس کے باوجود مَیں نے بار بار فون کر کے تنظیم اساتذہ کے قائدین سے درخواست کی کہ وہ ملک صاحب کے لیے تعزیتی ریفرنس رکھیں۔ مَیں بدگمانی سے کام نہیں لیتا لیکن اس چیز کا خاصا امکان تھا کہ تنظیم روایتی سستی کا شکار ہو جاتی اور ریفرنس نہ ہوتا یا اگر تاخیر سے ہوتا تو ملک صاحب کی فیملی کو دوبار جوہرآباد سے آنا پڑتا اس لیے میں نے سوچا کہ ایک ہی ریفرنس رکھ لیا جائے۔ تاریخ طے ہونے پر مَیں نے بروقت اپنے احباب کو تحریری اطلاع دے دی کہ تحریک اصلاحِ تعلیم، تنظیم اساتذہ کے ساتھ مل کر ملک صاحب مرحوم کے لیے تعزیتی ریفرنس رکھ رہی ہے لیکن تقریب سے تین چار دن پہلے جو دعوت نامہ تنظیم اساتذہ کی طرف سے چھپ کر آیا اس میں تحریک اصلاحِ تعلیم کا نام ہی نہ تھا اور دعوت نامہ ڈیزائن کرنے والے اور اسے منظور کرنے والے اصحاب کو اتنا بھی پتہ نہیں تھا کہ ملک صاحب مرحوم 'آفاق' کے بانی ڈائریکٹر جنرل تھے، محض ڈائریکٹر نصابیات نہ تھے۔

پھر ریفرنس میں ملک صاحب کے صاحبزادے عبدالحسیب مجاہد کو بات کرنے کے لیے بہت کم وقت دیا گیا۔ مجھے بھی اس وقت بلایا گیا جب مغرب کی اذان ہونے والی تھی اور مجھے صرف تین چار منٹ ہی بات کرنے کا موقع مل سکا۔ میری خواہش تھی کہ ملک صاحب کی بیٹی ڈاکٹر طاہرہ کلثوم کو بھی (جو وہاں موجود تھیں) تقریر کا موقع ملتا اور مَیں نے اس کے لیے اسٹیج منتظم صاحب

سے کہا بھی لیکن ان کے لیے وقت نہ نکل سکا۔

بہر حال ان باتوں سے قطع نظر، ملک صاحب مرحوم کا تعزیتی ریفرنس ۲۶ نومبر ۲۰۲۱ء کو سید مودودی انسٹی ٹیوٹ میں سہ پہر ۳ بجے ہوا جس میں میرے دوستوں اور تنظیم اساتذہ کے ساتھیوں نے بھرپور شرکت کی۔ اجلاس کی صدارت کے لیے تنظیم کے موجودہ صدر صاحبزادہ صادق جان صاحب دیر سے تشریف لائے تھے۔ پشاور سے ڈاکٹر محمد اظہار الحق (سابق پروفیسر علوم اسلامیہ گومل یونیورسٹی ڈی آئی خاں) اور تونسہ سے پروفیسر غلام اکبر قیصرانی بھی تشریف فرما تھے۔ ملک صاحب کے کافی دوستوں کو ان کے بارے میں گفتگو کا موقع ملا۔ جن لوگوں نے گفتگو کی ان میں ڈاکٹر میاں محمد اکرم (ماڈریٹر) کے علاوہ پروفیسر ڈاکٹر مہر سعید اختر، پروفیسر ڈاکٹر ابصار احمد، محمد یحییٰ رشید ایڈوکیٹ، تاثیر مصطفیٰ (سینئر صحافی)، پروفیسر غلام اکبر قیصرانی (صدر تنظیم اساتذہ پنجاب)، پروفیسر ظفر حجازی، سید وقاص انجم جعفری، پروفیسر ڈاکٹر عبدالحمید، پروفیسر راؤ جلیل احمد شامل تھے۔ انہوں نے ملک صاحب کی تعلیمی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا اور ان کے ساتھ کام کرنے کی یادوں کو تازہ کیا۔

راقم نے چند منٹ کی گفتگو میں ملک صاحب مرحوم کی تعلیمی مہارت اور بے باک ناقدانہ صلاحیت کی مدحت کی اور اس تاثر کا اظہار کیا کہ اس نابغۂ روزگار شخصیت کی صلاحیتوں سے جماعت اسلامی اور تنظیم اساتذہ نے کماحقہ فائدہ نہیں اٹھایا اور راقم بھی وسائل کی کمی کی وجہ سے نہ اٹھا سکا۔

دعائے مغفرت پروفیسر عظمت صاحب نے کرائی۔ طویل صدارتی تقریر، نماز مغرب کے بعد، صدر تنظیم اساتذہ نے فرمائی جس میں یہ بھی کہا کہ ان کے ذاتی روابط تو ملک صاحب سے نہ تھے لیکن تعلیمی کاموں خصوصاً سنگل نیشنل کریکلم کے حوالے سے (جن میں ملک صاحب کے مؤقف سے ماڈریٹر صاحب کو شدت پسندی کی جھلک نظر آتی تھی) وہ ان سے رابطے میں تھے۔ مجلس کے اختتام پر دعائے خیر تنظیم اساتذہ کے سابق مدار مہام جناب پروفیسر نصیر الدین ہمایوں صاحب نے کرائی اور یوں یہ تعزیتی ریفرنس کوئی چھ بجے کے قریب اختتام کو پہنچا۔ اس پروگرام کو کامیاب بنانے میں ملک صاحب مرحوم کے دوست پروفیسر وقار کاری صاحب نے بہت محنت کی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کی دعاؤں کو ملک صاحب کے حق میں قبول فرمائے، ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقامات سے نوازے، آمین ثم آمین۔

تعلیم و تربیت

پروفیسر ڈاکٹر اظہار الحق[1]

اصلاحِ تعلیم کے لیے ناگزیر اقدامات

میرے خیال میں اصلاح تعلیم کے لئے درج ذیل باتوں کا ہونا ضروری ہے:

۱۔آئین پاکستان کی رو سے انٹر تک مفت تعلیم کی فراہمی ریاست کی ذمہ داری ہے۔ریاست کو اس سے فرار کی بجائے اسے نبھانا چاہیے۔

۲۔تعلیمی نظام/ پالیسی کو قومی نظریات، روایات اور ضروریات سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔

۳۔تعلیمی نظام سے ملٹی نیشنل اداروں (ورلڈ بنک، آئی ایم ایف وغیرہ) کی مداخلت اور دباؤ سے آزاد کیا جائے اور اسے ملکی نظریات وضروریات کے مطابق ملکی ماہرین تعلیم کے ذریعے تشکیل دیا جائے۔

۴۔تعلیمی مقاصد کا قبلہ درست کیا جائے اور تعلیم کو قوم و ملک کے لیے باکردار تعلیم یافتہ ماہرین فن پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا جائے، نہ کہ اسے تجارت اور پیسے کمانے کی انڈسٹری بنایا جائے۔

۵۔اساتذہ ان افراد کو بنایا جائے جو اس منصب/ پیشے کو شعوری طور پر اپنائیں، نہ کہ اسے محض ذریعۂ روزگار سمجھیں۔

۶۔تعیناتی کے بعد ان اساتذہ کی اخلاقی تربیت کی جائے تاکہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو نہ صرف بہتر طور پر سمجھیں بلکہ انہیں دیانتداری سے ادا بھی کریں۔

۷۔نصاب کو اس طور پر ترتیب دیا جائے کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ عملی تربیت پر بھی زور دیا جائے۔

۸۔مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لیے اساتذہ کو فکر معاش سے آزاد کیا جائے اور ان کی ترقی کو بہترین کارکردگی سے مشروط کیا جائے۔

---

[1] پروفیسر (ر) علوم اسلامیہ، گومل یونیورسٹی، ڈی آئی خاں

تعلیم و تربیت ڈاکٹر اللہ بخش ملک

انسانی زندگی میں استاد کی اہمیت

چند اہم شخصیات کا احوال

* عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے اپنے بیٹے مامون کو استاد کے پاس بھیجا۔ استاد نے آتے ہی مامون کو بلاوجہ ایک ڈنڈا جڑ دیا۔ مامون نے درد سے بلبلاتے ہوئے اُستاد سے پوچھا: مجھے بلا سبب کیوں مارا ہے؟ استاد نے کہا: چُپ، خاموش ہوجا۔ مامون اس بلاوجہ چھڑی مارنے کے بارے میں جب بھی استاد سے پوچھتا تو استاد کہتا: خاموش۔

بیس سال کے بعد یہی مامون جب خلیفہ وقت بن گیا تو اسے اپنے ذہن پر نقش وہ بلاوجہ کی مار یاد آ گئی اور اس نے اپنے استاد کو بلوا بھیجا۔ استاد کے آنے پر مامون نے پوچھا: جب میں چھوٹا تھا آپ نے مجھے ایک بار کیوں بلاوجہ مارا تھا؟ استاد نے پوچھا: تو ابھی تک وہ مار نہیں بھولا؟ مامون نے کہا: اللہ کی قسم میں تو کبھی بھی نہ بھولوں گا۔

استاد نے مسکراتے ہوئے مامون کو دیکھا اور کہا: مَیں جانتا تھا کہ تو ایک نہ ایک دن مسلمانوں کا خلیفہ بنے گا۔ اور میں نے تجھے جان بوجھ کر بلاسبب پیٹا تھا تاکہ تو یاد رکھے کہ ''مظلوم کبھی بھی بھولا نہیں کرتے''۔

استاد نے مامون کو دوبارہ نصیحت کرتے ہوئے کہا: کبھی کسی پر ظلم نہ کرنا۔ ظلم ایک آگ ہوتی ہے جو مظلوم کے دل میں کبھی بھی نہیں بجھتی، چاہے کتنے بھی سال کیوں نہ گزر جائیں۔

* سلطنت اومان کے سلطان قابوس بن سعید کا پروٹوکول کے بارے میں اپنا خاص نظریہ تھا۔ وہ زندگی بھر کسی شخصیت کے استقبال کے لیے ہوائی اڈے نہ گئے۔ مگر ان کی یہ عادت اُس وقت ٹوٹ گئی جب انہوں نے انڈیا کے صدر شنکر دیال شرما کا ہوائی اڈے پر جا کر استقبال کیا۔ حکومتی اراکین اور عہدیداران اس بات پر حیران و پریشان تو تھے ہی صحافیوں کے لیے بھی یہ سب کچھ انوکھا اور حیرت و تعجب کا سبب بن گیا تھا۔

سلطان قابوس بھارتی صدر سے اس کے جہاز میں کرسی پر سے اٹھنے سے پہلے ہی جا کر گلے ملے۔ اس کے ساتھ ہی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے جہاز سے نیچے اترے۔ جب کار کے نزدیک پہنچے تو ڈرائیور کو اتر جانے کا کہا، خود جا کر کار کا دروازہ کھولا، مہمان کو بٹھایا اور خود ہی کار چلا کر مہمان کو اپنے محل میں لائے۔

بعد میں جب صحافیوں نے سلطان سے اس کا سبب پوچھا تو انہوں نے جواب میں بتایا کہ میں ایئرپورٹ پر انڈیا کے صدر کے استقبال کے لیے ہرگز نہیں گیا۔ میں ایئرپورٹ پر اس وجہ سے گیا ہوں کہ میں نے بچپن میں انڈیا کے شہر پونا کے ایک سکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ جناب شنکر دیال شرما اس وقت میرے استاد ہوا کرتے تھے اور انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ زندگی کیسے گزارنی ہے اور زندگی میں آنے والی مشکلات اور مصائب کا کیسے سامنا کرنا ہے! اور میں آج تک حتی المقدور کوشش کرتا ہوں کہ جو کچھ اُن سے پڑھا اور سیکھا تھا عملی زندگی میں اس پر عمل کروں۔ تو یہ تھی ایک استاد کی قدرومنزلت جو سلطان کے اپنے پروٹوکول نظریات سے انحراف کا سبب بنی تھی۔

* کچھ دن پہلے کی بات ہے جب روسی صدر پیوٹن کو اپنے استقبال میں کھڑے لوگوں کے ہجوم میں اپنی ایک استانی نظر آ گئی۔ پیوٹن نے سارے گارڈز، حفاظتی عملے اور حفاظتی حصار بالائے طاق رکھ کر سیدھا استانی کو جا کر گلے لگایا اور وہ رو رہی تھی۔ خلقت کے ہجوم میں استانی کو ساتھ لے کر باتیں کرتے اور چلتے ہوئے ایسا لگ رہا تھا کہ پیوٹن اپنی استانی کے ساتھ نہیں کسی ملکہ کے پہلو میں چل رہا ہے۔

اولاد کی تربیت کیسے کریں؟

قرآن حکیم کی تلاوت سے گھر گونجنا چاہیے۔ وہ گھر مقبرہ ہے اور مقبرہ بھی فرعون کا ہے، جہاں قرآن کی آواز نہیں گونجتی۔ روز سب بچوں کے ساتھ سیرت کی نشست کیا کریں۔ اہتمام سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت واقعات کی شکل میں پڑھیں۔ ایک دن پڑھیں، دوسرے دن بچوں کا امتحان لیں۔ امتحان حافظے کا بھی لیں اور عمل کا بھی لیں۔ بچے پر کبھی کمپرومائز نہ کیجیے گا۔ اس میں حیا ہونی بہت ضروری ہے، بڑوں کا ادب ہونا بہت ضروری ہے، سچ بولنا بہت ضروری ہے اور سخاوت بہت ضروری ہے۔ (احمد جاوید)

اسلام اور پاکستان ڈاکٹر محمد امین

پاکستان میں نفاذِ دین۔ کیوں اور کیسے؟

محمد دین جوہر صاحب کی 'تنظیم اسلامی' کے موقف پر تنقید اور ڈاکٹر ابصار احمد صاحب کا ان کا محاکمہ

جب اس موضوع پر تنظیم اسلامی کا سیمینار ہوا تھا تو ہم نے ایک صفحہ کا ہلکا پھلکا تبصرہ اس پر کر دیا تھا (البرہان شمارہ اکتوبر ۲۰۲۱ء) کیونکہ ہم اس موضوع کو ٹارگٹ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اب بھی ہم اس موضوع پر قلم نہ اٹھاتے اگر ہمارے محترم دوست ڈاکٹر ابصار احمد صاحب محمد دین جوہر صاحب کے اس سیمینار کی ویڈیو پر مختصر تبصرہ کو سہ ماہی 'حکمتِ قرآن' کے تازہ شمارے (اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۲۱ء) میں زیر بحث نہ لاتے۔ ڈاکٹر صاحب نے محمد دین جوہر صاحب کے مؤقف کو ناپسند کیا ہے اور اس پر نقد کیا ہے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں اور محمد دین جوہر صاحب کی فلسفیانہ، دانش ورانہ اور جناتی زبان، ہم تسلیم کرتے ہیں، کہ ہماری سمجھ میں کم ہی آتی ہے۔ ڈاکٹر ابصار صاحب تو خیر فلسفے کے استاد ہیں اور ہم تو شاید اس کے سنجیدہ طالب علم بھی شمار نہ ہوں.... بایں ہمہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ محمد دین جوہر صاحب نے جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے، ان میں وزن ہے اور حق ان کی طرف ہے۔ ہم اس کی اپنے انداز اور الفاظ میں یوں وضاحت کرتے ہیں:

ہم سمجھتے ہیں کہ جدید اسلامی تحریکیں (جن کی بڑی نمائندگی مشرق وسطیٰ میں الاخوان المسلمون اور جنوب مشرقی ایشیا میں جماعت اسلامی کرتی ہے [اور تنظیم اسلامی اسی کی آف شوٹ ہے] اور جنہیں فکری بنیادیں سید مودودیؒ نے مہیا کی ہیں) اپنی کچھ خوبیوں کی چھب دکھانے کے بعد فکری، نظری اور عملی طور پر پٹ چکی ہیں اور وقت آ گیا ہے کہ ان کے اہل فکر ونظر چیزوں پر نظر ثانی کریں (۱)۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو تاریخ کی نذر ہو جائیں گے.... جیسا کہ وہ ہو رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلم زوال کے اسباب کی کرید کرتے ہوئے اور اس کا درماں تلاش کرتے

---

(۱) کہیں کہیں اس کے آثار نظر بھی آ رہے ہیں لیکن انہیں قابل اعتناء نہیں سمجھا جا رہا جیسے امیر جماعت اسلامی ہند سید سعادت اللہ حسینی صاحب نے تسلیم کیا کہ ماضی میں ہماری دینی تعبیر 'سیاسی' تھی جسے اب 'تہذیبی' ہونا چاہیے۔ اس پر ہم نے تبصرہ کیا کہ نہیں یہ ''تعلیم وتزکیہ'' پر مبنی ہونی چاہیے۔ یہ بحث دیکھنے کے لیے ملاحظہ فرمایئے البرہان کا شمارہ مئی وجون ۲۰۲۰ء

ہوئے مولانا مودودیؒ جس نتیجے پر پہنچے یعنی حکومت الٰہیہ اور اقامت دین کا ان کا مخصوص تصور جس کا مرکزی نقطہ 'اسلامی ریاست کا قیام اور اس کے ذریعے نفاذ دین' تھا، فکری اور عملی طور پر ناکام ثابت ہو چکا ہے کیونکہ پہلے مرحلے میں وہ مغربی فکر و تہذیب کے غلبے کا ردّ عمل تھا اور ردّ عمل عموماً حسنِ توازن سے محروم ہوتا ہے چنانچہ جمہور اہل علم نے اسے 'دین کی سیاسی تعبیر' قرار دے کر ردّ کر دیا۔ اور دوسرے مرحلے میں دین کی وہ سیاسی تعبیر مغرب کی ملحدانہ تہذیب کی سیاسی فکر (ڈیموکریسی، نیشنلزم، نیشن سٹیٹ)، سے مفاہمت پر اتر آئی اور اس نے 'اسلامی جمہوریت، انتخابات اور اقامتِ دین و نفاذِ دین بذریعہ سیاسی جدوجہد' کا روپ دھار لیا[1]۔ ہم مغربی استعمار کی اسلام دشمنی، اسلامی تحریکوں کی مخالفت اور مسلم گماشتہ حکومتوں کو اس مقصد سے استعمال کرنے کو تسلیم کرتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جمہور علماء اور جمہور امت نے دین کی اس سیاسی تعبیر اور اس کے عملی مظاہر کو رد کر دیا جس کا ثبوت یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ میں اخوان اور پاکستان میں جماعت اسلامی جمہور علماء کی مخالفت اور جمہور عوام کی عدم حمایت کی وجہ سے اپنا مزعومہ 'اسلامی انقلاب' لانے میں ناکام ہو چکی ہیں (تنظیم اسلامی مولانا مودودیؒ کے تصور اقامت دین ہی کی علمبردار ہے، اور اسی کی نظری سٹرٹیجی کو فالو کرتی ہے۔ جماعت سے اختلاف اسے صرف انتخابات کے حوالے سے نہ ہے کہ اقامتِ دین کی بنیادی فکر کے لحاظ سے)۔

اصل بات یہ ہے کہ جمہور علماء اور جمہور امت کے نزدیک اسلام کا تقاضا اور مسلم روایت یہ ہے کہ دین انفرادی اور اجتماعی زندگی میں فرد کے اس پر عمل کرنے کی چیز ہے نہ کہ ریاستی تحکم سے نافذ کرنے کی۔ بلاشبہ مسلمانوں کی ریاست کو اس کا موید ہونا چاہیے (اور اگر وہ نہ ہو تو اس کی اصلاح کی کوشش بھی کی جانی چاہیے) تاہم اگر مسلمان حکمران بہت صالح مسلمان نہ بھی ہوں اور اقتدار کو حمایت دین کے لیے استعمال نہ کریں تو بھی مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ۸۰، ۹۰ فیصد اسلامی تعلیمات پر عمل کر سکتے ہیں، اپنی ذاتی حیثیت میں اور معاشرتی تنظیم کے ذریعے (جیسا کہ مسلم معاشرے پہلی صدی ہجری سے مساجد، مدارس، خانقاہوں اور فقہ و افتاء کے ذریعے اسلامی تعلیمات پر عمل کرتے آ رہے ہیں، بغیر فعال حکومتی مدد کے) [تفصیل کے لیے دیکھیے ہماری کتاب 'خاموش انقلاب ناگزیر ہے']۔ یہ کام اگر صدیوں سے کامیابی سے ہوتا آ رہا

---

[1] ملاحظہ ہو اس ضمن میں مولانا مودودیؒ کی تصریح مشمولہ 'اسلامی ریاست' ص: ۶۳۶ - ۶۴۲، طبع اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۶۷ء

ہےتو آج بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر اس میں توسیع کیوں نہیں کی جاسکتی؟

اقامت دین کی سیاسی تعبیر کا نقصان یہ ہوا کہ اس نے ترجیحات کو بدل دیا۔قرآن حکیم نے پیغمبر اعظم و آخر (ﷺ) کو اسلامی تبدیلی کے لیے جو لائحہ عمل دیا تھا وہ تلاوت و تعلیم کتاب، تعلیم حکمت اور تزکیۂ نفس پر مشتمل تھا۔ دعوت واصلاح اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر اسی کا مظہر تھے۔نئی تعبیر دین نے اس کی جگہ اسلامی ریاست کے قیام اور سیاسی جدوجہد کے ذریعے اسلامی قانون سازی اور نفاذ دین کو دے دی۔ مسلم زوال کی اصل وجہ ایمان کی کمزوری اور مسلم تعلیم وتزکیہ کے نظام کا دیمک زدہ ہو جانا تھا جس نے وہ متوازن اور متحرک شخصیت پیدا کرنا بند کر دی جو قرآن حکیم اور اسوۂ رسول (ﷺ) پر عمل کا منطقی تقاضا تھی لیکن جدید دینی تحریکوں کی نئی تعبیر دین نے اس منہج کو نہیں اپنایا اور مسلمانوں کی اصلاح اور تعمیر سیرت کی بجائے ان کے ووٹ سے اسلامی تبدیلی لانے کی کوشش کی۔اس کوشش کا ناکام ہو جانا ہمارے نزدیک فطری اور منطقی تھا چنانچہ جدید دینی تحریکیں اور دینی سیاسی جماعتیں مسلم عوام کی عدم حمایت کی وجہ سے مسلم معاشرے میں کہیں بھی کامیاب نہیں ہو سکیں جسے محمد دین جوہر صاحب نے عوام کے تہذیبی شعور کا نتیجہ قرار دیا ہے۔

محمد دین جوہر صاحب جب کہتے ہیں کہ مذکورہ سیمینار میں 'نفاذ' پر بات ہی نہیں ہوئی تو یہ بات اپنے جوہر میں اس لیے صحیح ہے کہ جیسا کہ ہم ذکر کر چکے کہ مسلم روایت میں دین فرد کے اس پر انفرادی اور اجتماعی زندگی میں عمل کرنے کی چیز ہے جس کے ایمانی محرکات داخلی ہوتے ہیں نہ کہ نافذ کرنے کے۔ یہ بات سیمینار میں زیر بحث نہیں آئی اور آ بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ یہ اس تصورِ اقامت دین کے خلاف ہے جس کے مولانا مودودیؒ اور ڈاکٹر اسرار احمدؒ مدعی اور داعی ہیں۔ دوسرے یہ کہ عصر حاضر کی مسلم ریاست کو اسلام اور مغربی جمہوریت وقومی ریاست کا اگر ملغوبہ بنا دیا جائے جیسا کہ پاکستان اور عالم اسلام میں بنا دیا گیا ہے تو اسلامی مقاصد کے لحاظ سے اس کا ناکام ہونا منطقی امر ہے، جیسا کہ جدید دینی تحریکیں قیام اسلامی ریاست اور نفاذ دین بذریعہ ریاستی اقتدار کے مشن میں عملاً ناکام ہو چکی ہیں۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اسلام اور مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب ایک دوسرے سے متضاد پیراڈائم ہیں اور ان میں تلفیق ممکن نہیں۔ اگر ان میں تلفیق کی کوشش کی جائے تو اس کا نتیجہ لازماً مغربی فکر و تہذیب کے غلبے اور نفاذ کی صورت میں اور اسلامی اصول واقدار کی پسپائی کی صورت میں نکلے گا جیسا کہ پاکستان، مصر، اردن، تیونس، ملائشیا اور

دوسرے مسلم ممالک کے تجربات سے ظاہر ہے۔ لہٰذا جو ہر صاحب کا کہنا صحیح ہے کہ ہمارے دینی عناصر عصری ریاست کی ڈائنامکس کو سمجھتے ہی نہیں۔

مسلمان جب تک عصری ریاست کے حوالے سے "لا" پر نہیں آئیں گے وہ "اِلّا" کی منزل نہیں پا سکیں گے۔ سادہ لفظوں میں جب تک امت مسلمہ کے دماغ مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب کو صراحت سے کفر قرار دینے اور رد کرنے کی ہمت نہیں کر پاتے اور اس کی جگہ اجتہاد کر کے اسلام کے سیاسی نظام کی تشکیل نو کرنے اور اسے نافذ کرنے کی ہمت نہیں کر پاتے اور فرد اور معاشرے کے دین پر عمل کے لیے تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس کو اس کا ذریعہ نہیں بناتے، اس وقت تک "رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً" کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

ہم اس بات کی صراحت بھی کر دیں کہ سیاست اس ہمہ گیر اسلامی تبدیلی کے منصوبے کا محض ایک حصہ ہے۔ یہ پوری تہذیب اور پورے نظام زندگی کی بات نہیں ہے۔ پورے نظام زندگی کو بدلنے کا نسخہ وہی ہے جو قرآن حکیم نے دیا ہے یعنی 'تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس'۔ جدید دینی تحریکوں کے لوگ اسے محض دعوت وتبلیغ اور تصوف کہہ کر اس کی تحقیر کرتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ تہذیب تو فرد پر ہی کھڑی ہوتی ہے۔ جب تک آپ فرد کو نہیں بدلتے، معاشرہ اور ریاست بدل ہی نہیں سکتے۔ فرد کو کیسے بدلا جائے؟ اس کا جواب قرآن حکیم نے تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ کی صورت میں دے دیا۔ "فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ"؟

ڈاکٹر ابصار احمد صاحب اور جماعت وتنظیم وتحریک میں ہمارے دوست اگر اس تحریر کو پڑھ کر بدمزہ ہوئے ہوں تو ان سے معذرت۔

آخری بات: اس کے لیے صرف دینی سیاسی جماعتوں کو نشانہ بنانا کافی نہیں۔ ہماری اصلاحی تحریکیں (جیسے تبلیغی جماعت)، ہماری تعلیمی تحریکیں (جیسے دینی مدارس اور 'دینی' لوگوں کے سکول، کالج اور یونیورسٹیاں) اور ہمارا صوفیاء کا طبقہ سب دیمک زدہ اور قابل اصلاح ہیں۔ یہ سب تحریکیں اور ادارے مسلم زوال کے مرض کا درماں نہیں ہیں، یہ یا تو مغرب کی الحادی فکر و تہذیب کا ردّعمل ہیں یا اس سے مرعوبیت کا شکار ہیں۔ ان سب کی تشکیلِ نو اور 'فکّ کل نظام' کی ضرورت ہے اور تشکیلِ نو کے لیے تفکیرِ نو کی ضروری ہے، ایسی تفکیرِ نو جس کی جڑیں ہمارے قابل فخر ماضی میں پیوست ہوں، جس کا حال عصری تحدیات کا ادراک کرنے والا ہو اور جس کا مستقبل جہانِ نو کی نوید دے سکتا ہو۔ هذا من عندنا والعلم عند الله.

پاکستانیات ڈاکٹر محمد امین

عمران خان کیوں ناکام ہوئے؟

عوام الناس کے نزدیک عمران خان کی ناکامی یہ ہے کہ ان کے عہد میں مہنگائی کم ہونے کی بجائے بہت زیادہ ہوگئی جس نے ان کا جینا دوبھر کر دیا۔ دوسرا نعرہ انہوں نے کرپشن کے خلاف جدوجہد کا لگایا تھا۔ اس میں بھی وہ ناکام ہوئے اور لوٹا ہوا پیسہ نہ نکلوا سکے۔

سوال یہ ہے کہ ان دنوں بڑی ناکامیوں کی وجہ کیا ہے؟ ہمارے نزدیک اس کے دو بڑے سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو ان کے نظریات تھے ان کے مطابق انہوں نے ٹیم تیار نہیں کی اور ہوم ورک نہیں کیا۔ ظاہر ہے اقتدار مقصد نہیں ہوتا بلکہ حصول مقاصد کا ذریعہ ہوتا ہے۔ جب تک نظریات واضح نہ ہوں اور ان کے مطابق ٹیم تیار نہ کی جائے تو مقاصد حاصل نہیں کیے جا سکتے۔

موجودہ حالات میں عوام کو معاشی ریلیف مہیا کرنے کے لیے ہنگامی اور انقلابی اقدامات کی ضرورت ہے جو عمران خان نہیں کر سکے۔ ہماری رائے میں اس کی ایک بڑی صورت یہ ہے کہ آپ بیرونی ادائیگیاں مؤخر کرنے کا (مثلاً دس سال کے لیے) مطالبہ کریں اور اس پر ڈٹ جائیں اور مغرب کے آگے ہرگز نہ جھکیں۔ ہما انصف سے زیادہ بجٹ تو ان پر لگ جاتا ہے۔ یہ پیسہ اگر عوام کو ملے تو ان کے حالات بہتر ہو جائیں گے۔ اس کے لیے صرف جذبہ، جرأت اور مضبوط اعصاب کی ضرورت ہے۔ جس کا مظاہرہ خان صاحب نہیں کر سکے۔ اقبال نے مومن کی تعریف میں کہا تھا کہ ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

خان صاحب نے اس کے برعکس کیا۔ اندرونی محاذ پر نہ ختم ہونے والی لڑائی چھیڑ دی اور بیرونی عناصر کے آگے لیٹ گئے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ ہماری آواز ان تک پہنچ سکتی ہے لیکن سلامتی کا راستہ ہماری نظر میں بہرحال یہی ہے۔

تفہیم مغرب سید خالد جامعی

مغربی سائنس کی ہلاکت خیزیاں

* ماڈرن ازم، اس کی ریاست، اس کی سائنس، اس کی ٹیکنالوجی کتنی پرتشدد ہے اس کا اندازہ صرف ایک خبر سے ہوتا ہے کہ یورپ میں گزشتہ چالیس سال میں ۶۲۰ ملین پرندے ختم ہو گئے۔ عام چڑیا بھی آدھی رہ گئیں (جنگ کراچی ۲۱ نومبر ۲۰۲۱ء)

* عالم اسلام میں غامدی صاحب جیسے بہت سے مفکرین ابھی تک یہی سمجھ رہے ہیں کہ سائنس تسخیر فطرت کا ذریعہ ہے جبکہ سائنس درحقیقت تجہیز و تکفین و تدفینِ فطرت کا ذریعہ ہے۔ سائنس فطرت دوستی میں آگے نہیں بڑھی بلکہ وہ فطرت دشمنی میں آگے بڑھی ہے۔ تین سو سالوں میں فطرت کو سائنس نے اس طرح تباہ کیا ہے کہ اسٹفین ہاکنگ کو کہنا پڑا کہ زمین کا کرہ تباہ ہونے والا ہے۔ اس کی تباہی سے پہلے دنیا دوسرے کروں (Planets) میں رہنے کی جگہ تلاش کر لے۔ یونیورسٹیوں میں ۱۹۸۰ء کے بعد کھلنے والے ماحولیاتی سائنس کے شعبے خود اس بات کا ثبوت ہیں کہ سائنس تباہ کن ہے۔ اصولاً تو اس نئے شعبے کے کھلنے کے بعد سائنس کے شعبے بند کر دینے چاہئیں تھے کہ سائنس نے بے پناہ تباہی پھیلائی لیکن معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ سائنس بھی چل رہی ہے اور ماحولیاتی سائنس کے شعبے بھی چل رہے ہیں۔

* سائنس کی دنیا میں اکثر اتفاق رائے نہیں ہوتا لیکن تمام سائنس دانوں کا اتفاق رائے اس بات پر ہو چکا ہے کہ اگر ترقی کی موجودہ رفتار کو یعنی کارخانوں کی چمنیوں کے دھوئیں کو، تیل کے استعمال سے ہونے والی آلودگی کو، زمین، پانی اور ہوا کو تباہ کرنے والے صنعتی فضلے (Industrial Waste) کو روکا نہیں گیا تو کرۂ ارض تباہ ہو جائے گا۔ اس کے باوجود سائنس کے بارے میں کسی کے دل میں کوئی تنقیدی لہر اور حقارت پیدا نہیں ہوتی۔ یہ عمل سائنس زدگی کا عمل ہے۔ سانپ کا کاٹا پانی مانگتا ہے سائنس کا کاٹا سائنس ہی مانگتا ہے۔ سائنس اور اس کی آلودگی کو سمجھنے کے لیے صرف چار بنیادی کتابیں پڑھ لیجیے، ان شاءاللہ نفع ہوگا:

1. ElectromagneticPollution - A Hidden Stress to yourSystem

2. Against Ecological Sovereignty - Saving the Natural World.

3. Deep Economy: The Wealth of World Communities - the Durable Future.

4. What every Enviormantlist needs to know about Capitalism.

عالم اسلام کے اکثر مفکرین سائنس کے بارے میں کوئی تنقید پڑھنا ہی نہیں چاہتے کیونکہ وہ سائنس پر ایمان لا چکے ہیں اور جب سائنس کسی کا عقیدہ وایمان بن جائے تو اس کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔

* سائنس سرمایہ دارانہ نظام اور ریاست کے بغیر نہیں چل سکتی لہٰذا سرمایہ دارانہ نظام کو سمجھنے کے لیے یہ کتابیں پڑھیے:

- The Making of an Economic Socity
- The Origion of Capitalism
- Protestant Ethics Capitalism

لاہور کی یونیورسٹی LUMS کے طلباء کو ماحولیاتی تباہی، آلودگی وبربادی پر ایک کتاب پڑھائی جاتی ہے جس میں تباہی کے مناظر دکھائے جاتے ہیں اور تباہی کا حل بتایا جاتا ہے لیکن یہ نہیں پڑھایا جاتا کہ اس تباہی کا اصل سبب کیا ہے؟ کیوں کہ تباہی کا اصل سبب تو سائنس وٹیکنالوجی ہے جو سرمایہ دارانہ نظام نے پیدا کی اور جس کی پشت پر جدید ریاست موجود ہے۔ ریاست سرمایہ داری کے بغیر چل سکتی ہے لیکن سرمایہ دارانہ نظام جدید ریاست کے بغیر نہیں چل سکتا۔ ریاست، سرمایہ، سائنس وٹیکنالوجی اور مارکیٹ کا گٹھ جوڑ پوری دنیا کو تباہ کر رہا ہے لیکن ان سب کے بارے میں ماحولیاتی سائنس کچھ نہیں کہتی۔ ماحولیاتی سائنس اصلاً Correction Mechanism ہے جو سائنس کی تباہ کاریوں کو کم کرنے، چھپانے، بیوقوف بنانے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ کتاب کا نام پڑھیے:

S.E.Spoolman, Environmental Science

یہ کتاب جدید سائنس وٹیکنالوجی کے خلاف مقدمہ ہے۔

سائنس دان کس طرح جھوٹ بول کر حقائق چھپاتے ہیں اس کے لیے ایک کتاب پڑھیے:

Noami Orskes, The Merchant of Doubts

اس مصنفہ کی ایک کتاب مغربی تہذیب وامریکہ کی تباہی کے بارے میں ہے۔

N.Orskes, The Collaps of Western Civilization

اس میں وہ لکھتی ہے کہ سائنس اور ماحولیاتی آلودگی امریکہ کو ۲۰۹۵ءتک زوال میں لے جائے گی لیکن وہ یہ لکھنا بھول گئی کہ اس سے دنیا کی تقدیر کیسے بدلے گی؟ کیونکہ بھارت اور چین، امریکہ اور کا مغرب کا، متبادل بن چکے ہیں۔اس کی کتاب کے آخر میں اس کا انٹرویو موجود ہے وہ بھی پڑھنے کے لائق ہے۔

بقیہ: علم کا ایک اور آفتاب غروب ہوا

انہوں نے ۱۹۹۹ء سے خود کو تحریک اسلامی کے لیے وقف کر دیا تھا۔لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جماعت اسلامی کے عمائدین نے ایک ہیرے کو کھو دیا۔کاش تحریک اسلامی ان سے کام لے لیتی۔ اتنا بڑا آدمی جو ان بیس سالوں میں بہت سے ریسرچ سکالرز پیدا کر سکتا تھا اسلامی تناظر میں تعلیمی بورڈ اور یونیورسٹی چلا سکتا تھا لیکن جماعت اسلامی کے قائدین کی بے حسی کی بھینٹ چڑھ گیا۔اس کے تجربے اور علم سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا گیا۔

ملک محمد حسین صاحب جیسے کئی اور ہیرے اپنی طبعی عمر پوری کرتے ابد کی جانب بڑھ رہے ہیں لیکن ان کے علم اور تجربے سے جماعت اسلامی محروم ہے۔اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ترجیحات تبدیل ہو گئی ہیں۔ تعلیم و تربیت کو اب زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی، عملی سیاست ہی اب محور و مرکز ہے۔اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت عطا فرمائے۔

ملک محمد حسین صاحب کا اس دنیا سے چلے جانا جہاں اہلِ پاکستان، تحریک اسلامی، تنظیم اساتذہ اور تحریک اصلاحِ تعلیم کا نقصان ہے وہاں وہ مجھے بھی علمی طور پر یتیم کر گئے ہیں۔ان کی صحبت میں رہ کر زندگی کی کئی گتھیاں ان کے علم کی روشنی میں سلجھا تا تھا۔اب وہ در بند ہو گیا ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ملک محمد حسین صاحب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور دین اسلام کے لیے ان کی خدمات کو قبول و منظور فرمائے، آمین، ثم آمین۔

افغانستان

ڈاکٹر محمد امین

لبرلز اور متجددین کی طرف سے

اسلامی افغانستان کی مخالفت اور مغرب کی حمایت

امریکی استعمار کی حمایت اور اسلامی افغانستان کی مذمت میں متجدد خورشید ندیم کے کالم ''افغانستان ۔ نئے المیے کے دہانے پر'' کا تجزیہ

طالبان حق پر ہیں اور وہ اللہ کے فضل سے جلد موجودہ مشکل حالات سے نکل آئیں گے اور غلبۂ اسلام کا ذریعہ بنیں گے اور لبرل اور متجددین ہاتھ ملتے رہ جائیں گے

خورشید ندیم صاحب اپنے کالم مطبوعہ روز نامہ دنیا شمارہ نومبر ۲۰۲۱ء میں فرماتے ہیں:

''آج کا افغانستان، طالبان کا افغانستان کہیں جسے، اپنی مادی بقا کے لیے دنیا سے مدد مانگ رہا ہے۔ طالبان کو اپنے اقتدار کے جواز کے لیے امریکہ اور دوسرے غیر مسلم ممالک کی سند چاہیے۔ کیا اسی کا نام آزادی ہے؟''

''افغانستان قحط کے دہانے پر کھڑا ہے۔ اقتصادیات کا کوئی وجود نہیں۔ دنیا اگر نہ چاہے تو خوراک مل سکتی ہے نہ شناخت۔ جب تک طالبان کی حکومت کو قبول نہیں کیا جاتا، افغانستان دنیا سے الگ تھلگ رہے گا۔ یہ قبولیت امریکہ کی مرضی کے بغیر نہیں مل سکتی۔ آزادی افغانستان سے آج بھی اتنے ہی فاصلے پر ہے جتنی طالبان سے پہلے تھی۔''

سوال یہ ہے کہ امریکہ کو یہ حق کس نے دیا ہے اور دنیا کے کس اصول اور قانون کی رو سے اسے یہ حق حاصل ہے کہ اس کی مرضی کے بغیر کسی ملک کو آزاد ملک تسلیم نہیں کیا جا سکتا؟ جس کی لاٹھی اس کی بھینس (انگریزی میں Might is Rtght) یعنی طاقتور جو بھی کہے اور کرے وہ صحیح ہوتا ہے، یہ جنگل کا قانون تو ہو سکتا ہے مہذب دنیا اسے تسلیم نہیں کرتی، اسلام بھی اسے نہیں مانتا۔ خورشید ندیم صاحب کس اصول کی بنیاد پر امریکی اور مغربی استعمار کی اس حرکت کی حمایت کر رہے ہیں؟

مغربی فکر و تہذیب سے مرعوبیت، مغربی استعمار کی حمایت اور مغرب سے لڑ کر آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد کرنے والے حریت پسندوں اور مجاہدین کی مذمت اور اسلام کی ایسی

تشریح کرنا جو مغربی افکار و خواہشات کے مطابق ہو۔فکری غلامی اور تجدد کی یہ لہر دورِ غلامی میں سرسید سے شروع ہوئی اور غلام احمد قادیانی سے ہوتی ہوئی عصر حاضر میں پرویز اور وحیدالدین خان سے ہوتی ہوئی پاکستان میں جاوید احمد غامدی اور ان کے تلامذہ (بشمول خورشید ندیم صاحب) تک پہنچی ہے۔بعض مداہنت پسند اور لبرل ذہن رکھنے والے علماء اور صحافی اسے ایک 'قابل قبول' نقطۂ نظر بنانے کے لیے تگ ودو کررہے ہیں جبکہ جمہور علماء اسے گمراہی قرار دیتے ہیں۔یہ لوگ نہ مسلم کشمیر پر ہندو کے قبضے کی مذمت کرتے ہیں اور نہ افغانوں کی جدوجہد کو، جو انہوں نے اپنے ملک پر کفار کے قبضے کے خلاف کی، اسے جہاد قرار دیتے ہیں۔اس کا سبب صرف ان کی ذہنی غلامی، فکری افلاس اور مغرب کی غالب فکر و تہذیب سے مرعوبیت ہے نہ کہ کوئی اصول۔

پھر خورشید ندیم صاحب فرماتے ہیں:''اس دنیا کا نظام ایسا ہی ہے۔آزادی کی نیلم پری کسی سبب ہی سے ہاتھ آتی ہے۔'ٹرائیکا پلس' نے مطالبات کی ایک فہرست طالبان کو تھما دی ہے۔اس کا محرک صرف امریکہ نہیں، روس، چین اور پاکستان بھی ہیں۔سب نے مل کر طالبان سے کہا ہے کہ وہ عالمگیر سطح پر تسلیم شدہ بین الاقوامی قوانین اور بنیادی انسانی حقوق کا احترام کریں۔سب افغان گروہوں کو شریک اقتدار کریں اور بچیوں کی تعلیم کو یقینی بنائیں۔کوئی ملک اب جزیرہ بنا کر نہیں رہ سکتا۔عالمی برادری سے اگر آپ سند جواز اور مالی مدد چاہتے ہیں تو پھر اس کے بنائے قوانین اور اس کی بنائی ہوئی قدروں کو بھی تسلیم کرنا ہوگا۔''

سوال یہ ہے کہ پاکستان ہمسایہ مسلم ممالک (ایران، تاجکستان، ازبکستان وغیرہ) اور علاقائی ممالک (جیسے چین اور روس) سے مشاورت کیوں نہیں کرتا اور انہیں افغانستان کی حکومت کو تسلیم کرنے کی ترغیب کیوں نہیں دیتا؟ امریکہ کو ان اجلاسوں میں کیوں بلایا جاتا ہے؟ یہ اجلاس ''ٹرائیکا'' کا کیوں ہوتا ہے؟ امریکہ کا افغانستان سے اور خطے سے کیا تعلق ہے کہ اسے اہمیت دی جائے؟ اصل بات یہ ہے کہ حکومت پاکستان کا رویہ غلط اور بزدلانہ ہے۔وہ خود امریکہ اور مغرب کی معاشی غلامی میں مبتلا ہے اور اس میں بھی اسے سازش سے جکڑا گیا ہے لیکن کسی پاکستانی حکمران میں اتنی جرأت اور ایمانی غیرت نہیں کہ وہ اس معاشی غلامی کے جال کو توڑنے کی کوشش کرے۔ نتیجہ یہ ہے کہ انہیں امریکہ کی غلط اور ناجائز باتیں بھی ماننا پڑتی ہیں جیسا کہ وہ افغانستان کے معاملے میں مان رہا ہے اور اسے ہمت نہیں ہو رہی کہ وہ افغانستان کی حکومت کو تسلیم کرے یا اس

کے مسلم ہمسایوں اور علاقائی طاقتوں کو ترغیب دے کہ وہ افغانستان کو تسلیم کر لیں۔

چین اور روس کیوں افغانستان کو تسلیم نہیں کر رہے اور اس معاملے میں کیوں امریکہ کی حمایت کر رہے ہیں؟ اس کی متعدد وجوہ ہیں۔ پہلی اور بنیادی وجہ تو یہ ہے کہ "الکفر ملة واحدة" کفار اپنے کفر پر (اسلام کے مقابلے میں) متحد ہو جاتے ہیں لیکن افسوس ہے مسلمانوں پر کہ وہ کفر کے مقابلے میں اسلام پر متحد نہیں ہوتے۔ یہ ہماری کمزوری ہے جس پر ہمیں قابو پانا چاہیے۔ ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے کہ مسلمان ممالک اسلام پر متحد کیوں نہیں ہوتے؟ اس کا جواب واضح ہے کہ مغرب انہیں متحد ہونے نہیں دیتا۔ او آئی سی کا ہیڈ آفس سعودی عرب میں ہے اور سعودی عرب سو فیصد مغرب کے جال میں پھنسا ہوا ہے۔ مسلم ممالک کو ہمت، غیرت اور جرأت کے ساتھ اپنے اتحاد کو یقینی بنانا چاہیے اور اس معاملے میں مغرب کی سازشوں اور اس کی دھونس کو رد کر دینا چاہیے۔

چین اور روس کے افغانستان کو تسلیم نہ کرنے میں ان کے اپنے مفادات بھی ہیں۔ چین اپنے علاقے چینی ترکستان (جسے اب سنکیانگ کا نام دیا گیا ہے) کے کروڑوں مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ رہا ہے اور انہیں اسلامی روایات کے مطابق زندگی بسر کرنے کی اجازت دینے پر تیار نہیں بلکہ انہیں ملحد چینی معاشرے میں ضم ہونے پر مجبور کر رہا ہے (یہ محض مغرب کا پروپیگنڈا نہیں ہم چند پاکستانیوں کے وہاں کے چشم دیدہ حالات 'البرہان' میں شائع کر چکے ہیں جو ان مظالم کی تصدیق کرتے ہیں)۔ وہاں کے جبر سے تنگ آ کر کچھ حریت پسند پاکستان اور افغانستان مدد اور ٹریننگ کے لیے آ گئے۔ پاکستان کو سی پیک پر چینی مدد کی چونکہ ضرورت ہے لہٰذا پاکستان نے ان چینی حریت پسندوں کی مدد کرنے سے انکار کر دیا لیکن طالبان نے ان کی دست گیری کی۔ اب چین کا طالبان سے مطالبہ یہ ہے کہ اگر ہماری سیاسی اور معاشی مدد درکار ہے تو چینی ترکستان کے حریت پسندوں کی مدد نہ کرنے کا ہم سے معاہدہ کرو۔ ظاہر ہے طالبان اس کے لیے تیار نہیں۔ جہاں تک روس کا تعلق ہے تو افغان مجاہدین نے اسے جو شکست دی تھی اور جس کی وجہ سے سوویت روس ٹوٹ گیا تھا، وہ کوئی ایسا زخم نہیں جو اتنی جلد بھر جائے، لہٰذا روسی بھی اندر سے یہی چاہتے ہیں کہ طالبان ناکام ہو جائیں، کمزور ہو جائیں اور اسے گھس بیٹھنے کا پھر موقع ملے۔

جہاں تک امریکہ کا تعلق ہے تو جنگ میں طالبان سے شکست کھانے کے بعد اب اس نے

انہیں سیاسی اور معاشی مار دینے کے لیے امن کا چولا پہن لیا ہے۔ اس کی پوری کوشش ہے اور وہ اس کے لیے مسلسل سازشیں کر رہا ہے کہ افغانستان کی طالبان حکومت ناکام ہو جائے اور اسے شادیانے بجانے، طالبان سے انتقام لینے اور دوبارہ سیاسی و معاشی طور پر وہاں پیر جمانے کا موقعہ مل جائے۔ اس کے لیے وہ چوتھی جنگ لڑ رہا ہے۔ بھارت کی مدد سے وہ داعش کو ابھار رہا ہے کہ وہ طالبان کے خلاف لڑے اور وہاں دھماکے ہو بھی رہے ہیں۔ معاشی طور پر اس نے افغانستان کے آٹھ ارب ڈالر دبا لیے ہیں اور ان کی ادائیگی سے انکاری ہے حالانکہ وہ افغان حکومت کے پیسے ہیں اور کسی اصول اور قانون کی رو سے امریکہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ان کے پیسے واپس نہ کرے۔ اس کے ساتھ ہی وہ یورپ، آسٹریلیا اور ایشیا میں اپنے اتحادیوں کو یہ لائن دے رہا ہے کہ افغانیوں کی مالی مدد نہ کی جائے۔ سیاسی طور پر اس نے یہ طے کر رکھا ہے کہ نہ اس نے افغانستان کو ایک آزاد مملکت تسلیم کرنا ہے اور نہ دنیا سے تسلیم کرنے دینا ہے۔ اس کے لیے وہ اپنی سیاسی قوت اور اثر و رسوخ استعمال کر رہا ہے۔ امریکہ یہ ساری سازشیں اس لیے کر رہا ہے تاکہ طالبان حکومت ناکام ہو جائے۔

سوال یہ ہے کہ یہ ساری باتیں جو ہمیں نظر آ رہی ہیں خورشید ندیم صاحب کو کیوں نظر نہیں آتیں؟ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان کی آنکھوں پر مغربی فکر و تہذیب اور اس کے علمبردار استعماری امریکہ و یورپ سے فکری مرعوبیت کی پٹی بندھی ہوئی ہے اور انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ سچ فرمایا مالک الملک نے کہ ”فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ ۝“ [الحج ۲۲:۴۶] یعنی یہ آنکھیں نہیں بلکہ دل ہیں جو اندھے ہو جاتے ہیں تو پھر آنکھیں دیکھ ہی نہیں سکتیں۔

خورشید ندیم صاحب کہتے ہیں کہ ”سب نے مل کر طالبان سے کہا ہے کہ وہ عالمگیر سطح پر تسلیم شدہ بین الاقوامی قوانین اور بنیادی انسانی حقوق کا احترام کریں۔ سب افغان گروہوں کو شریک اقتدار کریں اور بچیوں کی تعلیم کو یقینی بنائیں۔“

سوال یہ ہے کہ طالبان سے ایسے احمقانہ مطالبے کیوں کیے جاتے ہیں جن پر مطالبہ کرنے والے خود بھی عمل نہیں کرتے۔ کیا جو بائیڈن نے ری پبلکنز کو شریک اقتدار کیا ہوا ہے؟ کیا روس اور چین نے اپنی پارٹی کے مخالفین کو حکومت میں شامل کیا ہوا ہے؟ کیا عمران خان مسلم لیگ ن اور

پیپلز پارٹی کو اقتدار میں شامل کرنے پر تیار ہیں؟ اگر ان سوالوں کا جواب نفی میں ہے تو طالبان سے یہ مطالبہ کرنا کیونکر جائز ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے مخالفین کو حکومت میں شامل کریں۔

ہم بچیوں کو تعلیم دینے کے حق میں ہیں بشرطیکہ یہ تعلیم انہیں اسلامی اقدار سے منحرف نہ کرے۔ سوال یہ ہے کہ ایک مسلم معاشرے میں خواتین کے حقوق کیا ہونے چاہئیں؟ کیا اس کا فیصلہ امریکہ اور مغرب کرے گا؟ کتنی احمقانہ بات ہے کہ افغانستان کے مسلم اور قبائلی روایتی معاشرے میں خواتین کے کردار کو مغرب کے مادر پدر آزاد معاشرے پر قیاس کیا جائے!

خورشید ندیم صاحب مزید کہتے ہیں کہ ''اس بات کو بھی فراموش کیا گیا کہ آج کی دنیا ایک عالمگیر نظم کے تحت چل رہی ہے جس کا تعین بیسویں صدی میں کردیا گیا تھا جب دنیا سے سلطنتوں کا دور ختم ہوا۔ یہ نیا سیاسی بندوبست کم وبیش ایک صدی سے قائم ہے۔ آج ہر ملک کی سیاسی اور معاشی بقا اس نظام کے ساتھ وابستگی سے مشروط ہے۔''

سوال یہ ہے کہ یہ عالمی سیاسی نظام کس نے قائم کیا ہے اور کیا یہ منصفانہ ہے؟ یا یہ ناانصافی پر مبنی ہے اور بدلے جانے کے قابل ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ یہ نظام امریکہ ویورپ نے قائم کیا ہے اور اپنے مفادات کے لیے قائم کیا ہے؟ کیا 'اقوام متحدہ' میں دو ارب مسلمانوں کی مؤثر نمائندگی موجود ہے؟ نہیں! تو یہ منصفانہ کیسے ہے اور مسلمانوں کے لیے قابل قبول کیوں کر ہے؟

پھر جن عالمی قوانین ومعاہدوں اور بنیادی انسانی حقوق کو تسلیم کرنے کا مشورہ خورشید ندیم صاحب طالبان کو دے رہے ہیں کیا وہ قوانین مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب پر مبنی نہیں؟ کیا وہ ہیومنزم، سیکولرازم اور لبرل ازم جیسے غیر اسلامی نظریات کی پیداوار نہیں؟ کیا بنیادی انسانی حقوق کا چارٹر اسلام کے مطابق ہے؟ کیا عورتوں سے متعلق اقوام متحدہ کے قوانین غیر اسلامی نہیں؟ تو سوال یہ ہے جب وہ بین الاقوامی پلیٹ فارم پر دو ارب مسلمانوں کو نمائندگی نہیں دیتے اور اپنی تہذیب کو یونیورسلائیز کرنے کے لیے اپنی فکر وتہذیب پر مبنی قوانین بناتے ہیں جو مسلمانوں کے معتقدات کے خلاف ہیں تو مسلمان ان قوانین کو تسلیم کیوں کریں؟ اور پاکستان، سعودی عرب اور ان جیسے دوسرے مسلمان ممالک جنہیں سیاسی ومعاشی طور پر مغرب نے اپنے جال میں جکڑ رکھا ہے اگر وہ ان غیر اسلامی بین الاقوامی قوانین ومعاہدات کو مجبوراً قبول کریں تو طالبان سے کیوں کر یہ مطالبہ جائز ہوسکتا ہے جو ابھی ان جکڑ بندیوں کے عادی نہیں یا یہ طوق اپنے گلے میں ڈالنا نہیں چاہتے۔

اصولی بات تو یہ ہے کہ سارے مسلم ممالک کو مل کر ان غیر اسلامی بین الاقوامی قوانین ومعاہدات کو رڈ کر دینا چاہیے لیکن اسی لیے امریکہ ویورپ مسلمان ممالک کو متحد نہیں ہونے دیتے اور نہ انہیں اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل میں نمائندگی دینا چاہتے ہیں کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو غلام بنا کر اور دبا کر رکھیں تا کہ وہ سر اٹھا کر نہ جییں اور اپنے اصول وقوانین پر عمل کا مطالبہ نہ کریں۔

سوال یہ بھی ہے کہ خورشید ندیم صاحب اس قضیے میں امت مسلمہ کے ساتھ ہیں یا امریکہ ویورپ اور ان کے حلیفوں کے ساتھ؟ وہ طالبان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ان غیر اسلامی بین الاقوامی قوانین کو تسلیم کرو لیکن امریکہ ویورپ سے مطالبہ نہیں کرتے کہ تم اسلام اور مسلمانوں سے دشمنی اور ناانصافی چھوڑ دو۔ فیاللعجب ؎

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں
اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات ومنات

خورشید ندیم صاحب کو یہ بھی گلہ ہے کہ طالبان کی مزعومہ فتح اور امریکہ ویورپ کو شکست دینے کو یار لوگوں نے مذہبی بیانیہ بنالیا ہے۔ وہ اس مذہبی بیانیے کی بھی تغلیط اور مذمت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''مزید ستم یہ ہوا کہ اس کے لیے دینی استدلال بھی تراشا گیا، روایات کو حسب خواہش اس صورت حال پر منطبق کرتے ہوئے، یہ تاثر دیا گیا کہ یہ الٰہی فیصلہ ہے جس کا نفاذ ہو رہا ہے۔ دین اور عقل دونوں کو جذبات کی اس بھٹی میں جھونک دیا گیا۔''

یہ مذہبی بیانیہ کیا ہے جس کی وہ مذمت کر رہے ہیں؟ وہ بیانیہ یہ ہے کہ ایمان جیت گیا اور ٹیکنالوجی ہار گئی۔ اللہ نے چند ہزار مجاہدین کے ذریعے سارے امریکہ ویورپ اور ۴۸ ممالک کی فوجوں کو شکست دلائی اور اس کا قول برحق ہے کہ ''كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ''[البقرہ۲:۲۴۹]

ساری امت خوش ہے کہ دو صدیوں بعد پہلی بار مسلمانوں کو کفار پر فتح حاصل ہوئی جبکہ دیگر مسلم ممالک کی حالت پتلی تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ وہ بے بس اور کمزور ہیں اور کمزور سمجھ کر دبا لیے گئے ہیں اور اس کا وہ کچھ مداوا نہیں کر سکتے لیکن اللہ تعالیٰ نے طالبان کو توفیق دی، وہ کفر کے غلبے کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور اللہ کی نصرت سے کامیاب ہوئے۔ اس کا بہترین نقشہ اللہ تعالیٰ

نے سورۃ الانفال میں کھینچا ہے جہاں فرمایا: "وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝" [الانفال ۸:۲۶]

لہٰذا طالبان کو جو فتح ہوئی وہ بلاشبہ ایمان کی فتح ہے، وہ اسلام کی فتح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے چند ہزار افغان مجاہدین کو یہ ہمت دی کہ وہ بیس برس تک جان اور مال کی قربانیاں دیتے رہے اور اللہ کی نصرت سے کافروں پر غالب آئے! خورشید ندیم صاحب کو اس مذہبی بیانیے میں کیا شک ہے؟ کیا یہ اللہ کی نصرت نہ تھی کہ اس نے چند ہزار مجاہدین سے ائمہ کفر اور کفار کے متحدہ لشکر کو شکست دلوائی؟ اصل بات یہ ہے کہ امریکی سیاستدان اور جرنیل اس شکست کو تسلیم کر رہے ہیں، یورپ اور دوسرے حلیف امریکہ سے بھنائے ہوئے ہیں کہ امریکہ نے نہ صرف خود شکست کھائی بلکہ انہیں بھی لے ڈوبا لیکن خورشید ندیم صاحب جیسے متجددین اور لبرلز کو جو شاہ سے زیادہ شاہ پرست ہیں اور مغرب سے زیادہ مغرب پرست ہیں، یہ شکست ہضم نہیں ہو رہی۔ ان کا دل نہیں مانتا کہ ان کے محبوب اور غالب مغرب کو شکست ہو جائے۔ وہ جلے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہیں اور افغانوں کو جو مشکلات درپیش ہیں.... اور یہ مشکلات امریکہ اور اس کے حواریوں ہی کی پیدا کردہ ہیں.... ان کو سامنے رکھ کر کہتے ہیں کہ یہ کیسی آزادی ہے؟ یہ کیسی فتح ہے؟ یہ تو شکست ہے بلکہ شکست سے بھی بدتر ہے۔ ایسی ہی صورت حال پر مالک الملک نے سچا تبصرہ فرمایا تھا کہ "وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۭ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۭ" [آل عمران ۳:۱۱۹]

ہمیں یقین ہے کہ افغان طالبان جلد یا بدیر انہیں درپیش مشکلات پر قابو پالیں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس مرحلے میں بھی ناکام نہیں کرے گا بلکہ انہیں فتح عطا فرمائے گا اور وہ مشکلات سے نکل جائیں گے اور اپنے نظریات سے بھی دست بردار نہیں ہوں گے اور لبرل اور متجددین ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔ "وَقُلْ جَاۗءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۝" [الاسراء ۱۷:۸۱]

خورشید ندیم صاحب! یہ مذہبی بیانیہ صحیح ہے اور آپ کا اور آپ کے استاد امام جاوید احمد غامدی صاحب کا مذہبی بیانیہ غلط ہے کہ افغانستان میں طالبان کی مزاحمت جہاد نہیں تھی اور امریکہ کو درحقیقت شکست نہیں ہوئی۔ کاش اللہ تعالیٰ آپ کو اس پر غور کی توفیق عطا فرمائے!

افغانستان اوریا مقبول جان

مسلم ممالک افغانستان کی حمایت کیوں نہیں کرتے؟

وہ افغانستان کے معاشرتی اور معاشی بائیکاٹ میں امریکہ کی حمایت کیوں کررہے ہیں؟

ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک انسانوں نے اپنے مدِمقابل کو شکست دینے کے لیے تین محاذوں پر جنگ کی ہے۔ عسکری، معاشی اور معاشرتی۔ عموماً جنگوں یا دُشمنیوں کا آغاز ایک دوسرے کو معاشی طور پر نقصان پہنچانے سے کیا جاتا تھا۔ اس کے لیے ہر وہ حربہ استعمال کیا جاتا جس کے نتیجے میں دُشمن کوڑی کوڑی کا محتاج ہو جائے۔ کھڑی فصلوں کو آگ لگانے، قافلے لوٹنے اور دُکانیں جلانے سے بھی گریز نہ کیا جاتا تھا۔

تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ آلو کی کاشت کا رواج دراصل جنگوں میں فصلوں کو اُجڑنے سے بچانے کے لیے عام ہوا۔ آلو دراصل زیرِ زمین اُگتا ہے اور علاقے روندتی ہوئی افواج کے پاس کبھی اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ زمین کھود کر فصل کو تلف کریں۔ آلو اور جنگوں میں قحط سالی سے بچنے کا تعلق سترھویں صدی میں آئر لینڈ کی طویل جنگوں میں واضح ہوا جب وہ قوم صرف اسی آلو کی فصل کی وجہ سے مدتوں اپنے مدِمقابل افواج سے لڑتی رہی۔ ان دنوں آئر لینڈ کا ایک شخص اوسطاً دس آلو کھا جاتا تھا اور اپنے مویشیوں کو بھی آلو کھلاتا تھا، جن سے وہ دودھ اور گوشت حاصل کرتا تھا۔ ہسپانوی جب کولمبس کی سربراہی میں جنوبی امریکہ پہنچے تو انہیں یہ آلو بہت مرغوب لگا اور وہ اسے اپنے ساتھ سپین لیتے آئے۔ فریڈرک اعظم نے اسے دیکھا اور اس کے زیرِ زمین ہونے کو ایک نعمت قرار دیتے ہوئے کہا کہ اسے جنگوں میں فصلوں کی تباہی سے بچنے کیلئے وسیع پیمانے پر کاشت کیا جائے۔ جنگوں میں معاشی تباہی سے بچنے کے لیے زیرِ زمین بڑے بڑے غلے کے گودام بنائے جاتے تھے تاکہ ان کی خوراک کے ذخیرے حملہ آور افواج کی نگاہوں سے بچے رہیں۔ تجارتی راستوں کو روکنا، ناکہ بندی کرنا یہ سب کچھ معاشی مقاطعے کا ایک حصہ رہا ہے۔ مدینہ میں ہجرت کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پہلی جنگی حکمتِ عملی یہی تھی کہ کفارِ مکہ کے ان قافلوں کا راستہ روکا جائے جو شام کی سمت تجارت کے لیے جاتے تھے۔

معاشی تباہی یا مقاطعے کے ساتھ ساتھ ’معاشرتی بائیکاٹ‘ بھی انسانوں کے قدیم ترین ہتھیاروں میں سے ایک ہے۔ جب انسان قبائلی زندگی گزارتا تھا تو کسی ایک فرد سے لے کر

پورے قبیلے تک کی سزاء کے طور پر ان کی معاشرتی ناکہ بندی کر دی جاتی تھی۔ ہمارے ہاں اسے ''حُقہ پانی بند کرنا'' کہتے ہیں۔ اگر کسی فرد کو ''قبیلہ بدری'' کا حکم صادر کیا جاتا تو پھر اس کے لیے اپنے علاقے میں رہنا دُشوار ہو جاتا۔ اس لئے کہ اس سے کوئی دوسرا قبیلہ تعلقات رکھتا تو وہ دراصل بائیکاٹ کا حکم دینے والے قبیلے کے ساتھ جنگ کا خطرہ مول لے رہا ہوتا۔ بلوچستان کے قبائلی معاشرے میں اس طرح کے واقعات ابھی کل کی تاریخ ہیں۔ آپ کو پنجاب اور سندھ میں لاتعداد ایسے بلوچ خاندان ملیں گے جنہیں ان کے قبیلوں نے اپنے علاقوں سے نکالا تھا اور وہ یہاں آ کر آباد ہو گئے۔ دُشمنی کے خلاف دونوں حربے یعنی معاشی اور معاشرتی ناکہ بندی سے اگر معاملہ حل نہ ہو تو پھر تلواریں سونت لی جاتیں اور میدان میں نکل کر ایک دوسرے سے جنگ کی جاتی۔ یہی ترتیب آپ کو تاریخ کی تمام جنگوں میں نظر آتی ہے۔ سیرت النبی ﷺ کی ترتیب بھی یہی ہے۔ جس کا ایک باب ''شعبِ ابی طالب'' کے ابتلاء کے اڑھائی سال ہیں جب مکہ کے تمام سرداروں نے پورے بنی ہاشم قبیلے کا معاشی اور معاشرتی مقاطعہ کر دیا تھا اور رسولِ اکرم ﷺ اس مقاطعے سے خالصتاً اللہ کی مدد اور نصرت سے باہر آئے تھے۔

افغانستان میں طالبان کے حوالے سے پہلی دفعہ یہ ترتیب اُلٹائی گئی ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ ترتیب اُلٹی نہ ہو بلکہ موجودہ سماجی و معاشی مقاطعہ ایک نئی جنگ کے لیے تیاریوں کا آغاز ہو۔ طالبان کے ساتھ معاملہ یہ ہوا کہ اکتوبر 2001ء میں پوری دُنیا اپنی تمام عسکری قوت کے ساتھ ان پر چڑھ دوڑی۔ انہیں بظاہر فوری طور پر فتح نظر آئی جس نے حملہ آور قوت کو کامیابی کے غرور میں مبتلا کر دیا۔ شروع شروع میں امریکہ سمیت اڑتالیس ملک یہ سمجھ رہے تھے کہ ہم نے افغانستان سے طالبان کے وجود کو نیست و نابود کر دیا ہے۔ علاقے میں سے اپنے حامی تلاش کئے گئے اور انہیں مضبوط بنایا گیا۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ، آہستہ آہستہ طالبان کا جال ایسا پھیلا کہ اس میں امریکہ اور اس کے اتحادی پھنس کر رہ گئے اور کوئی راستہ نکلنے کا نظر نہ آیا تو مذاکرات کی میز پر آ بیٹھے اور ''باعزت رخصت'' ہو گئے۔ طالبان واپس برسرِ اقتدار آ گئے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امریکی ابتداء ہی میں عسکری طور پر کیوں افغانستان میں داخل ہوئے تھے؟ کیا صرف معاشی اور معاشرتی بائیکاٹ سے طالبان پر قابو نہیں پایا جا سکتا تھا۔ امریکہ اور عالمی برادری یہ حربے آزما چکی تھی۔ ۱۹۹۶ء سے ۲۰۰۱ء تک طالبان کی حکومت کو کسی بڑی عالمی طاقت اور یورپی ممالک نے تسلیم نہیں کیا تھا۔ تسلیم کرنے والے صرف پاکستان، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات تھے۔ طالبان نے دُنیا بھر کے ممالک کے معاشرتی بائیکاٹ کے باوجود

حکومت چلا کر دکھائی اور وہ بھی ایسی کہ ان کے دَور میں انصاف اور امنِ عامہ کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ اقوامِ متحدہ کے ادارے وہاں تھوڑی بہت مدد دیتے تھے لیکن وہ بھی بے دِلی کے ساتھ۔ یہی وجہ ہے کہ ۲۰۰۰ء میں جب وہاں شدید قحط سالی تھی، تو مارچ ۲۰۰۱ء کو بامیان میں بدھ کے مجسموں کی تباہی کا بہانہ بنا کر اقوامِ متحدہ کے دفاتر بھی بند کر دیئے گئے۔ ''یونیسف'' کی بیکریاں جو روٹی دیتی تھیں، بند ہوگئیں۔ پاکستان سے ''الرشید ٹرسٹ'' نے ہزاروں تندور افغانستان میں کھولے اور روٹی کی قلت نہ ہونے دی۔ یہی وجہ ہے کہ گیارہ ستمبر کے بعد الرشید ٹرسٹ ان چند تنظیموں میں سے تھا جس پر سب سے پہلے پابندی لگائی گئی۔ اس قحط سالی کے باوجود طالبان حکومت سات ماہ بعد بھی قائم تھی اور اب عالمی طاقتوں کے پاس اور کوئی راستہ باقی نہ تھا کہ ان پر حملہ کر دیا جائے۔ لیکن اب بیس سال بعد تین ہزار ارب ڈالر پھونکنے کے باوصف، فوجی سطح پر بھی ذِلت آمیز شکست ہوگئی۔ اب پہیہ پھر سے اُلٹا گھمایا جارہا ہے یعنی وہ تمام ممالک یا قوتیں جو میدانِ جنگ میں شکست کھا چکی ہیں، اب سفارتی اور معاشی بائیکاٹ کا ہتھیار استعمال کر رہی ہیں۔ اس ہتھیار کے استعمال کی باتیں فروری ۲۰۲۰ء سے شروع کر دی گئیں تھیں۔ دُنیا بھر میں یہ پروپیگنڈہ عام کر دیا گیا تھا کہ طالبان تنہا یہ حکومت نہیں چلا سکیں گے۔ امریکہ نے ۲۰ سالوں میں افغانستان کو بہت بدل دیا ہے۔ اب افغان پہلے جیسے نہیں رہے۔ اب یہ انٹرنیٹ کے عادی لوگ ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ امریکہ نکلا تو سب سے پہلے یہی انٹرنیٹ کے عادی لوگ ہی ایئرپورٹ کی جانب بھاگے اور امریکیوں کے ساتھ ہی ملک چھوڑ گئے۔ امریکی تبدیلی کی سب سے بڑی علامت تین لاکھ فوج تھی، جو کاغذ کے بنے ہوئے پُتلوں کی طرح ڈھیر ہوگئی۔ تین لاکھ عظیم فوجی اربوں ڈالر کا اسلحہ طالبان کے حوالے کر کے ہتھیار ڈال گئے۔ اب پیچھے رہ گئے طالبان اور ان کی افغان قوم، جنہیں لڑنا بھی آتا ہے اور جنہیں معاشی بائیکاٹ کا بھی تجربہ ہے اور معاشرتی مقاطعے کا اندازہ بھی۔ طالبان جو تازہ تازہ عسکری جنگ جیتے ہوئے ہیں اب یہ معاشی و معاشرتی مقاطعہ بھی ان شاء اللہ، جیت جائیں گے۔ اللہ اگر انہیں تعداد اور قوت میں کم ہونے پر 'بدر' کی طرح فتح یاب کرواسکتا ہے تو اس ''عالمی شعبِ ابی طالب'' سے بھی ضرور نکالے گا۔ یہ اس کا وعدہ ہے۔ لیکن روزِ حشر ایک ارب ۸۰ کروڑ مسلمان اپنے لیے جواب سوچ لیں کہ جب انہیں کٹہرے میں کھڑا کر کے سوال کیا جائے گا کہ جب چار کروڑ مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کیا گیا، تو غلے کے گوداموں اور عیش وعشرت کے سامان کے باوجود تم ان عالمی طاقتوں کی صف میں معاشی بائیکاٹ کرنے کیوں کھڑے ہوئے تھے؟ (92 نیوز)

تبصرۂ جرائد مدیر

کتاب نما

ماہنامہ 'الحق' کا مولانا سمیع الحقؒ نمبر

ماہنامہ الحق کا دینی جرائد میں اہم مقام ہے۔ دینی مدارس کے جرائد عموماً اصلاحی نوعیت کے ہوتے ہیں لیکن الحق میں اہم علمی مقالات بھی شائع ہوتے ہیں اور اس نے کئی خاص نمبر بھی شائع کیے ہیں۔ زیر تبصرہ شمارہ مولانا عبدالقیوم حقانی اور مولانا ارشد الحق سمیع نے بڑی محنت سے مرتب کیا ہے اور یہ بڑے سائز کی چار جلدوں/کتابوں پر مشتمل ہے۔ ہر جلد بڑی تقطیع پر تقریباً ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر جلد کے آخر میں اہم تصاویر موجود ہیں۔ ان چار جلدوں میں مولانا سمیع الحق کا تذکرہ وسوانح، فضل وکمال، عالمانہ ومحققانہ عظمت شان، محدثانہ جلالت قدر، تدریسی، تقریری، اصلاحی، تصنیفی جہادی اور سیاسی کارناموں کا تذکرہ ہے۔ یہ بالخصوص افغانستان کے چالیس سالہ جہاد، مجاہدین کی سرپرستی، طالبان کی فتوحات وانقلابات میں تاریخی کردار، اہل علم ودانش کے دلچسپ تاثرات ومشاہدات، افادات وملفوظات اور بے شمار جواہر پاروں کا حسین مجموعہ ہے۔ ان میں مولانا شہیدؒ کی ایمان افروز داستان حیات، شہادت اور سفر آخرت پر نامور اہل قلم کی طرف سے خراج عقیدت ومحبت پیش کیا گیا ہے۔ برائے رابطہ: 0315-9898998

سہ ماہی 'البیان' کوہاٹ

حضرت مولانا پروفیسر محمد اشرف خاں سلیمانیؒ نے (جو سید سلیمان ندویؒ کے مرید باصفا تھے) سلیمان اکیڈمی کے نام سے پشاور میں ایک ادارہ علمی، فکری اور تحقیقی مقاصد کے لیے ۱۴۰۱ھ میں قائم کیا تھا جس نے شوال ۱۴۰۳ھ سے ماہنامہ 'البیان' کا آغاز کیا جو تین سال بعد بند ہو گیا۔ (مولانا) طفیل کوہاٹی صاحب نے ندوہ التحقیق الاسلامی کے نام سے ایک ادارہ سلیمان اکیڈمی کے کام کے تسلسل کے لیے قائم کیا جس کے تحت جامعہ مظاہر العلوم کوہاٹ سے ایک عمدہ علمی سہ ماہی جریدہ 'المظاہر' کے نام سے نکالنا شروع کیا تھا جو بعد میں بند ہو گیا۔ اب انہوں نے 'البیان' کے نام سے ایک علمی وفکری سہ ماہی جریدہ کوہاٹ سے نکالنا شروع کیا ہے جو گویا ماہنامہ البیان اور سہ ماہی المظاہر کی طبع ثانی ہے۔ پہلا شمارہ عمدہ مضامین پر مشتمل ہے۔ امید ہے یہ رسالہ اپنے وقیع مضامین کی وجہ سے جلد علمی وفکری حلقوں میں اپنی جگہ بنا لے گا۔ برائے رابطہ موبائل نمبر: 0334-1947367

CPL No. 296 December 2021

پاکستان میں یوں تو بہت سی یونیورسٹیاں ہیں لیکن شاید ہی ان میں سے کوئی ایسی ہو جو اسلامی مقاصد کو پورا کرنے والی ہو، دینی تناظر میں کام کرتی ہو اور ایسی مسلم شخصیت کی تعمیر کرتی ہو جو عصر حاضر میں اسلام کا بہترین نمونہ ہو۔

ڈاکٹر محمد امین نے اس کتابچے میں یہ دکھایا ہے کہ اگر کوئی مطلوبہ یونیورسٹی قائم کرنا چاہے تو اُس کی نوعیت، شکل اور منہج کیا ہوگا۔ اعلیٰ تعلیم پر غور کرنے والوں کے لیے ایک فکر انگیز تصنیف۔

ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت

ڈاکٹر محمد امین

مکتبہ البرہان لاہور

15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

فون 0309-4607124 ای میل ermpak@hotmail.com